Comp

891.43

چینی کی انگوٹھی

اور

لوٹے کا راز

مرزا عظیم بیگ چغتائی

نہیں اور وہ یہ کہتی ہوں گی کہ اچھا ہے برتن مانجھنے کو تم مل گئیں ۔

اب تم بھی نہ مانو اور ہمارے سر پڑی رہو تو یاد رکھو کہ اگر تم نے زیادہ دق کیا تو ایک سے ایک "گھاگ" چھانٹ کر نہ مہیا کیا ہو تو ہمارا ذمہ ۔ ایسا جگی بڈھا کہ دو دن سے آگے نہ چلے اور تیسرے ہی روز پران ڈھیل دے" اور تم پھر بیوہ کی بیوہ ! اور پھر بھی اگر تم خود تو عضوِ معطل بنی بیٹھی رہیں تو یاد رکھو کہ قبر کے مُردوں سے تمہاری شادی طے کرینگے ۔

تم جانو تمہارا کام ۔ اب تک تو تم نے دیکھ لیا کہ یہی ہم نے کیا ہے اور یہی کرینگے جب تمہیں خود اپنا خیال نہیں تو ہم ماں باپ اور قوم کے سر میں کونسا پھوڑا نکلا ہے ۔

سن لو کان کھولکر کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے رسول عربیؐ نے پکار کر کہہ دیا کہ بیوہ مختار ہے وہ جانے اس کا کام ۔ حضرت سبیعہ رضؓ اور حضرت بی بی سیدہؓ سکینہ رضؓ بنت امام حسین سے سبق سیکھو اور وہ کرو جو مسلمان بیواؤں کو کرنا چاہیے اور پھر جو کوئی تمہاری راہ میں حائل ہو اس کے لیے جہنم ہے

جودھپور
۱۵ جنوری ۱۹۳۲ء

مصنف

چینی کی انگوٹھی

(۱)

انگوٹھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ ان سب میں سونے اور چاندی کی زیادہ مشہور ہیں۔ پھر بعض انگوٹھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انگلی میں ڈالنا وبالِ جان ہوکر "انگوٹھی کی مصیبت" ہوجاتا ہے۔ مگر یہاں میرا مطلب ایک عجیب و غریب "چینی کی انگوٹھی" سے ہے۔

ایک بڑے ضروری کام سے میں لکھنؤ سے بھی آگے جا رہا تھا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہرنا تھا گویا یہ کہئے کہ فی الحال لکھنؤ جا رہا تھا۔ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب کانپور والی گاڑی میں رکھ کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ ابھی گاڑی میں کافی وقت تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ریفرشمنٹ روم کو سونگھنے لگا۔ جالی میں سے اندر جھانکا۔ کچھ شبہ سا ہوا۔ غور سے جو جھانک کر دیکھا تو بھائی شذری! واللہ کس شان سے پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سامنے میز پر "لبالب" نہیں بلکہ "لدا لد" بھری ہوئی ایک کشتی رکھی تھی جس میں کیک، پیسٹریاں، چاکلیٹ، توس، مکھن، انڈے وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا بلائیں درج تھیں علاوہ چائے کے۔ بس کھانے کو بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ بیٹھتے بیٹھتے کچھ پیروی سنت رسول اللہ کا پاس یا پھر یہ کہ

ابھی ابھی اپنی ناک مروڑ رہی تھی! کچھ بھی ہو لپک کر ہاتھ دھونے کے لیے برابر والے کمرے میں نل پر پہنچے۔ اور ادھر لپک کر میں ان کی جگہ۔ ... بھائی شذری کے آنے کی آہٹ سن کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ میں نے کیک کھانا شروع کیا تھا اور لمحہ بھر میں ہی آدھے پر پہنچ چکا تھا۔ ویسے گو "شارٹ ہینڈ" تو میں نے نہیں سیکھا لیکن کھانے میں بحمد اللہ کافی سے زیادہ "زود نویس" ہوں۔ بھائی شذری اُدھر سے بھوک پہ دھار رکھے ہوئے آئے اور مجھے گردن جھکائے "محو خدمت" دیکھ کر بولے "ارے تم کہاں! میں منہ چلا رہا تھا تیزی سے! اور چونکہ بہ نسبت پلیٹ میں کیک رکھا رہنے کے صرف یہی خیال کرتا کہ میرے پیٹ میں رہے۔ لہٰذا اپنے رخسار کو کے لحاظ سے کچھ کچھ حضرت ڈارون کے مسئلہ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ورنہ تفسیر بنا بیٹھا تھا۔ لہٰذا بولتا کیا خاک۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کہہ کر بھائی شذری بھی کھانے پر تل پڑے۔ کیونکہ یہ موقع علیک سلیک کا بالکل نہ تھا۔ اور پھر علاوہ اس کے بھائی شذری ویسے بھی ایک قلفی کی برف والے کا مٹکا لوٹنے میں نمایاں حصہ کالج میں لے چکے تھے۔ جس نے شکایت کرنے کے لئے ادھر اُدھر بھاگنے یا غل مچانے کی بجائے کہ ہائے مجھے لڑکوں نے لوٹ لیا، یہ کیا تھا: کہ خود بھی اپنی ہی قلفیاں لوٹنے لگا۔ وہ جیتا اور لڑکے ہارے کیونکہ اس نے اپنے ماہر ہاتھوں سے قلفیاں کھول کھول کر چابکدستی سے ہتھیلیوں میں بٹا بٹ کر تیزی سے برف کھانا شروع کر دی تھی۔ کہ جو کچھ بھی اپنے پیٹ میں پہنچ جائے بہتر ہے۔

جب کیک اور عمدہ قسم کی مٹھائیاں ختم ہو چکیں اور گویا گھوڑ دوڑ ختم ہو لی اور محض روکھی سوکھی چیزیں رہ گئیں تب کہیں جا کر تبادلہ خیال ممکن ہوا۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا اور انھیں بھی۔

"کہاں جا رہے ہو یار؟" بھائی شنذری نے پوچھا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے جواب دیا۔

"پہلے تم بتاؤ!" بھائی شنذری نے چائے کی پیالی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

میں نے بھائی شنذری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوکھے منہ سے کہا۔

"ذرا لونڈے تک آیا تھا"

"جھوٹے ہو" بھائی شنذری نے چائے کی پیالی کو منہ سے ہٹا کر کہا "میں خود لونڈلہ تک آیا تھا" پھر اپنا منہ چائے کی پیالی سے ڈھک لیا۔

ہم دونوں جھوٹ بولے کیوں؟ شاید اس لیئے کہ دوسرا کہے کہ میں کرایہ دیدوں گا میرے ساتھ چلو۔ پھر لطف یہ کہ دونوں کو معلوم تھا کہ جھوٹ بولا جا رہا ہے۔

"کہاں بیٹھے ہو؟" میں نے برجستگی سے پوچھا۔

"سکنڈ کلاس میں" بھائی شنذری کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر اپنی غلطی محسوس کر کے اسی چاء کی پیالی سے جس سے کھیل رہے تھے جھنگ کر کہا "بے ایمان کہیں کا!"

یہ کہہ کر اپنی حماقت پر ہنسنے ہی والے تھے کہ زور سے سیٹی بجی گاڑی چھوٹنے کی۔ اس نامعقول سیٹی کو سن کر ہم دونوں گویا ایک دم سے جاگ اٹھے اور بھاگے ہم دونوں۔ مگر بھائی شنذری مع چاء کی پیالی کے جس کا کنڈہ کھیلتے کھیلتے اب انھیں پتہ چلا کہ انگلی میں پھنسا ہوا ہے۔ اِدھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر پیالی پار کیئے جاتا ہے تو اُٹھ لپکا کہ "لینا!"

ایک وقت میں بھائی شنذری کے ذمے اب دو کام تھے، ایک تو اپنی انگلی دیکھ کر چاء پیالی کا کنڈہ پھنسا ہوا نکالنا اور دوسرے بے تحاشا سر پہ پیر رکھ کر بھاگنا کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ اس کا ناظرین خود معلوم کر سکتے ہیں سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چاء کی پیالی کا صرف کنڈہ ہی کنڈہ رہ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قبل اس کے کہ میں

عرض کروں کہ کس طرح ایسا ہوا، ضروری ہے کہ یہ بھی عرض کردوں کہ نہ تو کوئی ریلوے ریگولیشن ایسا ہے کہ دو بدحواس بیک وقت پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے پائیں اور نہ پھر یہ کسی قاعدے یا بائی لاز کی رو سے ممنوع ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر کوئی بدحواس خوانچہ پھاندنے کی کامیاب یا ناکام کوشش نہ کرے۔ پھر ویسے بھی بدحواسی جرم تو نہیں۔ چنانچہ ادھر سے میرا شیر بیشۂ حماقت شنذری چلا ہے۔ اور اُدھر سے ایک اور صاحب زور شور سے ایک خوانچہ پھاند کر ریل چھوٹنے کی گھبراہٹ میں چلے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان دونوں کا ریلوے کی اصطلاح میں "میل" ہوا جیسے دو گاڑیوں کا ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ تحقیق کے ساتھ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے تاک کر اپنی ناک بھائی شنذری کے ہاتھ میں پھنسی ہوئی پیالی ماری تھی۔ یا پھر بھائی شنذری ہی نے ایک انداز قادرانہ کے ساتھ خود ان کی ناک پر پیالی کا وار کیا تھا کچھ بھی ہو دونوں گر کر اٹھے "اندھا ہے بے" بھائی شنذری کے منہ سے نکلا چشم زدن میں دونوں اٹھ کر سامنے والے ہی انٹر کلاس میں چلتی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان دونوں حضرات سے دو سکنڈ پہلے پہنچا تھا۔ اور مجھے دیکھ کر ہی بھائی شنذری اپنا سکنڈ کلاس چھوڑ کر جلدی میں ادھر آ گئے تھے۔ ہوٹل کے خانساماں کو مبلغ ایک روپیہ کلدار چائے کی پیالی کی قیمت یا جرمانہ پیش کیا۔ اب بھائی شنذری نے اپنے کلمہ کی انگلی کو دیکھا جس میں چائے کی پیالی کا کنڈہ ہی کنڈہ پھنسا رہ گیا تھا کھڑکی میں ہاتھ مار کر وہ توڑنے لگے کہ میں نے میں نے یونہی بغیر کسی وجہ کے ہاتھ روک کر کہا "یار اسے مت توڑو۔ ایک روپے کا ہے مجھے نکال دو۔"

---

(۳)

قبل اس کے کہ میں اپنا قصہ بیان کروں۔ ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کروں پنجاب سے لے کر دکن تک اگر ہاتھ کو کسی کے

گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا۔ لفظ "چانٹا" بہت عام ہے۔ تھپڑ بھی عام ہے۔ لیکن ان دو الفاظ کے ہم معنی جتنے لفظ یو۔پی اور نیز دوسرے مقامات پر رائج ہیں۔ ان کی "تلفظی" سائیکالوجی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چانٹے کے لاتعداد اقسام ہو سکتے ہیں۔ وہاں عوام نے مناسبت سے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ لیے ہیں۔ چانٹا وہ ہے جو غصہ میں کسی کے گال پر "عرض" کیا جائے۔ اس تلفظ ہی میں انگریزی اصطلاح آنوموٹوپیا مضمر ہے۔ یعنی لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک پٹاخے کی آواز کا مفہوم لیے ہوتے ہے۔ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں۔ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر چٹاخے کی آواز مفقود ہے۔ وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بد قسمت گال پر علاوہ ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ حصہ ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے جو آواز کی لطافت کھو دیتا ہے۔ مگر ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔ انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چانٹے کا ہم معنی لفظ طمانچہ ہے۔ مگر اس میں بھی وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے پھر طمانچہ برابر والوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لیے مخصوص ہے۔ تھپڑ کو بعض لوگوں نے پیڑ بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے۔ مگر کیا کیا جائے جہاں مجبوری یہ ہو کہ ایک طرف تو گال کسی موٹے آدمی کا ہو تو ہاتھ بھی مولانا شوکت علی کا۔ چربی کے وجود نے اس میں سستی پیدا کر دی۔ غرض اس قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں۔ چنانچہ انہی الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ لفظ "زناٹہ" ہے۔ یو۔پی سے اتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی زناٹے میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر۔ دراصل یہ چانٹا ہے ایک جدید تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے، چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز

پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آجاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کی وجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہے۔ اور وہ بدرجۂ اتم۔ لہٰذا "زناٹا" وہ چانٹا ہے جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہیں۔ اور برق رفتاری اس کے علاوہ۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں:-

عموماً مسافروں کا قاعدہ ہے کہ سفر کی گڑبڑ ہڑبڑ میں اکثر ضروری چیزیں ساتھ لینا بھول جاتے ہیں۔ جیسے ناشتہ دان، لوٹا، عقل، اخلاق، تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ قصداً بھی اسباب بکھیڑوں کی وجہ سے سامان ضروریات لے کر ہی نہیں چلتے۔ چنانچہ یہی بھائی شذری کا اصول ہے کہ عموماً عقل، اخلاق، اور تہذیب وغیرہ قسم کی تمام چیزیں قصداً سفر کی طوالت کی وجہ سے گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ مضبوط الاعضا حضرت جن سے بھائی شذری کی ٹکر ہوئی تھی ایک پوری کی پوری سیٹ پر دراز تھے۔ اور منہ پر اخبار تھا۔ چھوٹا ڈبہ تھا جگہ بالکل نہ تھی۔ اور دوسرے مسافروں کے آرام سے یہ بے نیازی اور غفلت بھائی شذری کو بے حد ناگوار گزری۔ چنانچہ بھائی شذری نے کہا:-

"اخبار پھر پڑھیے گا ذرا اٹھ کر بیٹھیے۔"

انھوں نے اخبار کو منہ سے ہٹایا اور جواب میں اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں، تاکہ ہم لوگ وہاں بیٹھ جائیں۔ اور پھر اخبار منہ پر۔ بھائی شذری کو بھلا یہ رعونت کب گوارا، ان کے ہاتھ سے جھٹ اخبار چھین کر ڈانٹا۔

"آپ آدمی ہیں . . . ."

وہ تڑپ کر اٹھے۔ اخبار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی!" اور بھائی شذری نے اخبار اونچا کر کے کہا "یا وحشت!"

"ادھر لاؤ اخبار" بڑھکر انھوں نے ڈپٹ کر کہا" بدتمیز کہیں کے" غضبناک ہو کر انھوں نے کہا۔ اس کے جواب میں بھائی شنذری نے ان کا چھ آنے کا ٹائمز آف انڈیا ریل کے باہر پھینک دیا۔

ادھر بھائی شنذری نے اخبار پھینکا ہے اور اُدھر انھوں نے جل بھن کر کباب ہو کر ایک استی نمبر کا زناٹا اس زور سے بھائی شنذری کے گال پر عرض کیا ہے کہ باوجود ریل کی گھڑگھڑاہٹ اور زنزناہٹ کے زناٹے کے زناٹے اور تڑاخے سے ڈبہ گونج گیا۔ بھائی شنذری کا منہ چرخے کی طرح گھوم گیا۔ اور بانکا فیلٹ ہیٹ وہ گرا۔ بھائی شنذری نے سنبھلتے ہی ایک دو تین ہاتھ تابڑ توڑ ان کے دیئے۔ انھوں نے حملہ کو روک کر بقول کسے "الجھاوے" سے ہاتھ نکال کر ایک زناٹا بھائی شنذری کے اور دیا۔ کوئی پچھتر نمبر کا۔ مگر اب میں بھی اپنے عزیز دوست کی امداد پر آچکا تھا۔ مگر تین گھونسوں میں سے ایک تو اوپر والی بنچ پر پڑا تھا۔ دو غنیم کے لگے تھے۔ اس دوران میں علاوہ الی دوز پاتوں کے طرفین سے دس بیس ہاتھ چل چکے تھے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا اور ہم دونوں قطعی دشمن پر بھاری پڑتے کہ "ہیں ہیں" کر کے دو تین مسافروں نے قابو میں کیا۔ اس کے بعد سخت کلامی کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور کس مشکل سے لوگوں نے شیروں کو قابو میں کیا ہے کہ بیان سے باہر۔ ہم دونوں دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ کیونکہ دراصل میں ایسے موقع پر تھا کہ جدل میں اچھی طرح شرکت ہی نہ کر سکتا تھا۔ اب اس جنگ کے نتیجہ پر غور کیجئے۔ چار کی پیالی کے کنڈے کی دھار وار لگڑ سے دشمن کے بائیں ہاتھ کی پشت پر زخم کاری لگا تھا، علاوہ اس زخم کے دشمن پر کوئی وار ہی سالم نہ اترا۔ یا تو کلائی پر رک گئے یا اوچھے پڑے۔ مگر ادھر بھائی شنذری کے گال پر زناٹوں کے نشان کس صفائی سے موجود تھے۔ کہ کان تک گواہی دے رہا تھا۔ اصطلاحاً یہ مار پیٹ تھی۔ مگر دراصل "پیٹ" کیونکہ غور جو کیا تو اس نتیجہ پر

پہنچنا پڑا کہ بھائی شنذری پیٹے ہیں۔ کیا میرے شیر نے بھائی شنذری کے چانٹے دیئے ہیں کہ ہنسی کو روکنا مشکل تھا۔ ہم دونوں اب دوسری بنچ پر بیٹھ گئے اور اور باتیں کرنا شروع کیں۔ اس شان سے بھائی شنذری نے سگار نکال کر سلگایا ہے کہ جیسے ان کو پٹنے سے نہ کبھی علاقہ رہا اور نہ ہے "اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے"۔ بھائی شنذری نے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں چپکے سے کہا۔

"قطعی" میں نے کہا، اور غور کرنے لگا کہ اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے، اس جملہ کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں ہے کہ اس سے آگے چل کر بھی پٹیں گے۔ کیونکہ یہ نالایق شخص نہ صرف تکڑا تھا بلکہ قطعی طور پر ہم دونوں سے اچھی طرح نبٹ لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر چاہتا میں بھی یہی تھا کہ اس موذی کو کسی طرح آگے چل کر موقع دیکھ کر مار دیں۔

اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔ بھائی شنذری کو میں ان کے سکنڈ کلاس میں بھلا کیوں جانے دیتا اور پھر شاید وہ خود بھی نہ گئے۔ غرض اب باتیں شروع ہوئیں، اور بیچ حال ایک دوسرے کو بتانا پڑا۔ بھائی شنذری لکھنؤ جا رہے تھے اور وہاں سے ایک دوسری جگہ اپنے ایک بڑے گہرے دوست سے ملنے۔

"یہ کون دوست ہیں تمہارے"

"ایک ہیں" بھائی شنذری نے جواب دیا۔

"کون ہیں آخر۔ کیا نام ہے ان کا کچھ تو بتاؤ؟"

"دوست تو کیا ہیں" بھائی شنذری بولے "ایک الو تو پھنسا ہے عجیب احمق ہے!"

"کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"محض ذرا سی ملاقات پر یا تعارف پر خط پہ خط، ملاقات کا شوق۔ تقاضہ

پہ تقاضہ، ناک میں دم کر دیا ہے یار میرے نے۔ مجبوراً وعدہ کرنا پڑا کہ کبھی لکھنؤ آئے تو تم سے بھی ملیں گے چلو نا یار تم بھی چلو۔" مجھ سے بھائی شذری نے زور دے کر کہا: "چلو نا تم بھی!"

(وہ حضرت جن کی ہم سے جنگ ہوئی تھی غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے اور گھورتے ہوئے پاخانہ گئے)

میں نے کہا "یار پہلے یہ بتاؤ کہ ہے وہ کون، کیا نام ہے، کیا کرتے ہیں، تم سے کب ملاقات ہوئی؟"

بھائی شذری نے سارا حال بتایا، نام بتایا، زمیندار ہیں۔ شکار کے بے حد شوقین ہیں۔ ملاقات کبھی نہیں ہوئی، غائبانہ تعارف ہے اور وہ بھی ایک بندوق کے خرید و فروخت کے سلسلے میں۔ اور پھر ایک دوسرے دوست کے بڑے گہرے دوست ہیں۔

"پھر تم نے اُسے بیوقوف اور احمق کیوں کہا؟" میں نے بھائی شذری سے پوچھا، اور ادھر وہ حضرت پاخانہ سے واپس آ کر بھائی شذری کے منہ گال پر اپنی انگلیوں کے نشان غور سے دیکھنے لگے مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں اور اپنی کارگذاری کو دیکھ کر کچھ مسکرائے۔ واقعی بھائی شذری کے سخت تھپڑ انھوں نے رسید کئے تھے، شذری بھائی نے ان کی مسکراہٹ اور وجہ مسکراہٹ کو معلوم کر لیا اور جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ان کی طرف دیکھ کر کہا جیسے کہ کھا جائیں گے ان کو پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ اور بھائی شذری نے اس سلسلہ میں کہا۔

"مجھے دراصل ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے کہ خواہ مخواہ دوستی کا رٹنا رٹے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار پہلی مرتبہ ملے گا تو خاطر بجد کرے گا۔"

"جبھی تو کہتے ہیں نا کہ چلو تم بھی، ایسا تو کم پھنستا ہے خوب۔ پلچ پلچ کر

کھائیں گے۔ کہ یاد ہی کرے کہ آیا تھا کوئی۔"

"کرایہ داخل کرو"، میں نے کہا۔

بھائی شذری راضی ہو گئے اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ساتھ چلیں گے اور اس احمق کے یہاں نہایت بے تکلفی سے ڈٹ ڈٹ کر کھائیں گے۔

۳

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور کیل لیئے اسٹیشنوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ اور دو آنے کے پیسے لے کر آپ کا نام وہیں کا وہیں برتن پر کھود دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کاریگر ہمارے ڈبے میں آیا۔ ریل رکنے پر ایک اسٹیشن پر لگا ایک صاحب کے لوٹے پر نام کھودنے۔ یہاں بھیڑ لگ گئی کس صفائی سے خط نستعلیق میں نام کھودتا تھا۔ بے حد پسند آیا خصوصاً بھائی شذری کو۔ ان کے پاس لوٹا نہ تھا۔ میرا لوٹا لے کر کہنے لگے اس پر نام کھدوائیں گے۔ میں اس بد ذوقی کا سخت مخالف مگر بھائی شذری نہ مانے اور نام کھدوانے لگے نام کھدوا کے لوٹا تو ایک کنارے رکھا اور لگے ہم دونوں اسٹیشن پر ٹہلنے۔

قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ پھر کیا ہوا، ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے اور بھائی شذری کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں۔ ہم دونوں علیگڈھ کالج کے تعلیمیافتہ، بھائی شذری تعلیم ختم کر چکے ہیں اور مجھے ابھی ایک سال اور پڑھنا تھا۔ ہم دونوں کے خیالات صنفِ نازک کے بارے میں بے حد بلند واقع ہوئے تھے اور ہیں چنانچہ کس بے کلی سے ہم دونوں نے دیکھا ہے کہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبہ سے ایک نوعمر خاتون نے اپنی گردن ایک طرف کو نکال کر جھکا رکھی ہے۔ اور ایک ہاتھ میں لوٹا لیئے پانی والے، کو پکار رہی ہے ہم کو تسلیم ہے کہ ہم اس کو دیکھنے کے دیکھتے ہی رہ

گئے۔ نہ کسی اور وجہ سے بلکہ شاید اس کے معصوم اور بھولے چہرے پر مظلومیت اور افسردگی دیکھ کر۔ وہ پانی مانگ رہی تھی اور کوئی نہ سنتا تھا۔ ہم دونوں چونکہ بالکل ہی قریب سے گذرے اور بھائی شذری تو بالکل ہی قریب سے۔ لہٰذا اس نے اپنا ہاتھ اور سر سب کچھ ڈبے کے اندر کر لیا۔ واپس تیزی سے لوٹنے میں ہم دونوں نے ایک دبی ہوئی آواز میں سُنا "چینی کی انگوٹھی" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ ایک اور چھوٹی سی لڑکی سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے جو بھائی شذری کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید اس کے جواب میں یہ کہا ہوگا "یہ چینی کی انگوٹھی" یا چائے کی پیالی کا کنڈہ بدستور بھائی شذری کے دائیں ہاتھ کی کلمہ کی انگلی میں پڑا ہوا تھا جس سے وہ برابر باتیں کرنے میں کھیلتے جاتے تھے۔

گرمی کی تپش سے ہر جاندار کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور خصوصاً سفر میں۔ متواتر تین اسٹیشنوں پر ہم دونوں نے اس غریب لڑکی کو پانی کے لیے لوٹے کو بھنڈی کی طرح ہلاتے دیکھا۔ اور اگر اس ہندوستان میں بدچلنی کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا کہ کسی غیر جنس کی طرف دیکھنا بھی مذہباً کفر ہو تو ہم کبھی کا اس کو پانی دے چکے ہوتے۔ دو ایک اسٹیشن بعد ہمیں اس کا خیال بھی نہ رہا کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

بھائی شذری سکنڈ کلاس مسافر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور لیمن سوڈا برف پینا چاہتے تھے، مگر لطف تو دیکھیے میرے خرچ پر۔ میں نے تجویز کی کہ برف خرید کر شربت بنا لیا جائے۔ چنانچہ گاڑی میں سے برف لیا اور پانی لوٹے میں لے کر واپس آہی رہا تھا کہ پھر اسی اداس اور غمگین مگر خوبصورت چہرے والی لڑکی کو اسی طرح لوٹا لٹکائے پانی کے لیے پکارتے سُنا۔ میں بالکل ہی قریب آگیا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ ریل نے سیٹی دی اور حرکت کی ہی تھی کہ میں نے لڑکی کے ہاتھ سے اس کا لوٹا لے کر اس

برجستگی سے اپنا لوٹا دیدیا کہ اُسے لیتے ہی بن پڑا قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہو اور معلوم کرسکے کہ کیا ہوگیا دوڑ کر خالی لوٹا لیے میں اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ بھائی شنڈری نے مجھے یہ کرتے دیکھا ہی لیا تھا میری اخلاقی جرات کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہیں مجھے بھی تو یہ کسی موذی سے نہیں پٹوائیں گے۔

میں نے غلطی کی جو اگلے اسٹیشن پر ہی اپنا لوٹا واپس نہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے بعد کے اسٹیشنوں پر گاڑی بہت دیر رُکی۔ اور تیسرے اسٹیشن پر زنانے ڈبے کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو زنانہ درجہ میں لڑکی نظر نہ آئی نہ معلوم کون تھی، کہاں، کب اور کدھر اتر گئی۔ مگر میرا لوٹا اس کے پاس تھا اور اس کا لوٹا میرے پاس۔

کانپور کے اسٹیشن پر ہم لوگوں کو اس کی فکر ہوئی کہ اپنے دشمن کو کس طرح ماریں، مگر کوئی صورت ممکن نہ ہوسکی۔ وہ بھی لکھنؤ جارہا تھا لہٰذا طے کیا کہ لکھنؤ پہ ماریں گے۔

لکھنؤ بھی دُور نہ تھا۔ زیادہ حصہ سفر بھائی شنڈری نے میرے ہی ساتھ طے کیا تھا۔ ویسے میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ سکنڈ کلاس میں جا بیٹھتا تھا۔ لکھنؤ کا اسٹیشن جب قریب آیا تو بھائی شنڈری نے مشورہ کیا کہ اسے مارو۔ چنانچہ موقع مل گیا۔ میں اسباب وغیرہ لے کر لکھنؤ کے اسٹیشن پر تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور بھائی شنڈری اُدھر دشمن کی طرف اسی لوٹے سے مسلح ہوکر پہونچے۔ موقع بھی خوب ملا۔ وہ لگا اپنے ٹرنک کا کنڈہ پکڑ کر قلی کے سر پر ٹرنک لدوانے اور پیچھے سے اس کے کوٹھے پر بھائی شنڈری نے لوٹے کی ٹونٹی پکڑ کر دیا کس کر لوٹا بالکل "وگر لند ھور" کی طرح، اور پھر جو سرپٹ بھاگے ہیں تو تیزی تو دیکھیے کہ میرے پاس سے نکل گئے اور مجھے بدحواسی میں دیکھا

تک نہیں جب میں نے آواز دی تو گھبرا کر کہا کہ چلو جلدی بھاگو۔ کیونکہ خوب جانتے تھے کہ اگر کہیں پکڑ پایا اُس نے تو۔ بُرے طرح گندی کرے گا۔ مگر پھر اس موذی کا پتہ نہ چلا۔

لکھنؤ میں ہم دونوں دو دن ساتھ رہے۔ پھر بھائی شذری اور ہم دونوں بارہ بنکی چلے۔ ان دوست سے ملنے۔ گاڑی جو بارہ بنکی کے پلیٹ فارم پر داخل ہوئی ہے تو ہم دونوں سر نکالے ہی ہوئے تھے۔ وہ موذی کھڑا نظر پڑا۔ اور ہم دونوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بھائی شذری نے غڑاپ سے گردن نیچی کر لی اور میں نے بھی۔ "اب یہ تمہیں قطعی ٹھونکے گا۔" میں نے بھائی شذری سے کہا۔

"اس کی ایسی تیسی" بھائی شذری نے کہا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ گاڑی رُکی اور جھٹکے سے وہ گویا جاگ اٹھے۔ ادھر میں نے کہا "قلی"، اور ادھر وہ موذی آ پہنچا۔ بھائی شذری نے لوٹے کا گرز بنا کر اپنے کو مسلح دکھایا۔ "سر پھوڑ دوں گا۔" بھائی شذری نے لوٹا چمکا کر کہا۔ مگر وہ نامعلوم کس گڑ بڑ میں تھا۔ گھونسہ دکھا کر تیزی سے چلتا بنا۔ اسباب اتروا کر ہم دونوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کیونکہ بھائی شذری نے اپنی آمد کا تار دے دیا تھا۔ اور اُمید پختہ تھی کہ ان کے دوست لینے آئیں گے۔ انتظار کر رہے تھے کہ پھر آیا وہ موذی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے اب گویا بھائی شذری کو ٹھونکنے کی تمہید اٹھائی۔

"جہنم سے"، بھائی شذری نے لوٹا تان کر کہا۔ "سر پھوڑ دوں گا۔"

"جانتے ہو کہاں ہو؟" اس نے کہا۔ "ریل کے دھوکے میں نہ رہنا۔ یہ بارہ بنکی ہے۔ ساری صاحب بہادری نکال دوں گا۔"

یہ کہہ کر شکر ہے کہ وہ چلتا بنا۔ اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک الفاظ

ہم دونوں نے اس کے لیے استعمال کیے تھے۔

"تار ملا نہ ہوگا" بھائی شذرہی نے کہا۔ قلی سے اسباب اٹھواکر باہر نکلے تانگہ کیا۔ اپنے دوست کا نام اور مفصل پتہ بتایا کہ لے چلو وہاں۔

تانگہ ایک گلی کے کنارے پر آکر رُکا اور ہم دونوں اس خیال سے کہ مکان کا پتہ لگالیں تو تانگہ ادھر لائیں۔ اتر کر اندازے سے ایک مکان پر پہنچے، وہاں کھٹکھٹایا۔ ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ دو مکان چھوڑ کر تیسرے پر دریافت کیجیے۔ وہاں پہنچے، ایک بڑا سا عالی شان پھاٹک تھا۔ اندر پہنچے۔ ملازم سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ اندر ہیں۔ ملازم نے بلوایا اور کہا بیٹھیے۔

آپ یقین مانیے کہ اندر سے وہی موذی چلا آتا ہے۔ اور نکلتے ہی وہ سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔ وہ روشنی میں تھا اور ہم اندھیرے میں تھے۔ "یہ تو وہی ہے" گھبراکر بھائی شذرہی نے کہا اور نوکر سے اتنا پوچھا "کیا یہی ہیں؟" اور جیسے ہی اس نے کہا "ہاں" بھائی شذرہی نے کہا "یار بھاگو!"

ہم دونوں سر پر پیر دھر کے جو بھاگے تو تانگہ پر آکر دم لیا۔ اور سیدھے وہاں سے اسٹیشن۔ ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے واپس لکھنؤ اور قبل اس کے کہ حضرت واپس پہنچیں، بھائی شذرہی نے لکھنؤ ہی سے معذرت کا خط لکھ دیا کہ افسوس میں حسب وعدہ حاضر نہیں ہو سکا۔

الحمدللہ کہ اب تک ان نادیدہ دوست سے بھائی شذرہی کے تعلقات دوستی اسی طرح قایم ہیں۔ اور واقعی بڑی گہری دوستی دونوں میں چلی آرہی ہے۔

میرا لوٹا جو بدل گیا وہ عجیب رنگ لایا۔ اس کے حالات "لوٹے کا راز" کے عنوان سے ہدیۂ ناظرین ہونگے۔

لڑکے کا راز

حصّہ اوّل

امّاں جان کی عادت تھی کہ اگر کہیں ایسی ویسی کوئی عورت گھر میں آجاتی تو مجھکو اس سے پردہ کرواتیں۔ ایسی ویسی عورت سے مطلب یہ ہے کہ مشتبہ عورت اور مشتبہ وہ کہ جو مجھکو دیکھنے کی نیت سے کسی دوسرے گھر سے آئے تاکہ کسی کی شادی کا پیغام لائے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ لڑکی کو دیکھ بھال لیتے ہیں اور ہر کسی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کو کسی معتبر شخص کی معرفت دکھوالیں۔ مگر ایسے تمام لوگوں کی کوششوں کو جس طرح اماں جان غلط کرنا جانتی تھیں شاید اور کوئی عورت نہ جانتی ہو۔ وہ احتیاط برتا کرتیں کہ بعض دفعہ خود مجھکو برا معلوم ہوتا۔ اگر کہیں جائیں تو مجھکو ساتھ نہ لیجاتیں۔ غرض ایک دنیا کو مجھ سے اور دنیا سے مجھکو چھپائے رکھتی تھیں۔ ایک طرف تو یہ اور دوسری طرف طرفہ بات کہ دن رات اسی فکر میں گھلی جاتی تھیں کہ میری شادی کہیں طے نہیں ہوتی۔ میں دل میں کہتی تھی کہ یا اللہ یہ آخر ان کو ہو کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو مجھکو اس طرح چھپاتی ہیں اور

دوسری طرف یہ شکایت کہ شادی نہیں ہوتی۔ جب کوئی دیکھے گا نہیں تو میں کہتی تھی کہ آخر پھر شادی کیسے کریگا۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ اماں جان کیتنی خوش تھیں۔ آخر کار میرا بھی ایک خریدار پیدا ہو گیا جو مجکو بے دیکھے بھالے بیاہنے پر راضی ہو گیا۔ ناظرین غور کریں کہ میرے اس وقت اس شخص کے بارے میں کیا خیالات ہونگے۔ میرا ایسا قدردان پیدا ہوا جو مجکو بے دیکھے لینے کو تیار تھا۔ میرے دل میں عجیب جذبات موجزن رہے۔ میں اس کی لونڈی کی طرح خدمت کروں گی۔ میں اس کی زرخرید بن کر رہوں گی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں اس نادیدہ منگیتر کتنا پسند کرتی تھی۔ حالانکہ مجکو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ وہ نیک بخت مجکو چاہنے والا میرا خریدار کون ہے؟

تیسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ کوئی ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ میں چونکی۔ میں غریب آدمی کی بیٹی گاؤں کی رہنے والی۔ بھلا کوئی ڈپٹی کلکٹر مجکو کیوں پوچھے گا۔ اور پھر ایک بات اور تھی، اور وہ یہ کہ ڈپٹی لوگ تو شہر میں نوکر ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ڈپٹی ہیں کہ ہمارے گاؤں سے پانچ کوس کے فاصلہ پر دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں۔ گاؤں میں پٹواری ذیلدار یا قانون گو ہوتے ہیں بھلا ڈپٹی کہاں سے آئے۔ اس معمے کو بھلا میں کیسے حل کرتی۔ کہاں تو اپنے نادیدہ خریدار کے خیال میں مستغرق تھی کہ اب اس کرید میں پڑ گئی۔ تیسرے روز یہ معمہ حل ہو گیا۔ جھاڑو دے کر میں کھانا پکانے جا رہی تھی کہ بہن رفو آگئیں۔ وہ خبر لائیں تھیں۔ اور ہم دونوں نے باورچی خانے میں بیٹھ کر باتیں کرنا شروع کیں۔

معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب بڈھے آدمی ہیں۔ پنشن لے کر گھر پر آ گئے ہیں۔ بڑی جائداد ہے۔ اور بہت سے بچے نہیں بلکہ بچوں والے لڑکے لڑکیاں ہیں۔

اب جو میں سوچتی ہوں تو مجکو عجیب معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ بن بیاہی، کنواری لڑکی بھلا کیا جانے کہ جوان میاں اچھا ہوتا ہے یا بڈھا۔ اس کا تو تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بڈھے اچھے ہوتے ہیں۔ محبت اور پیار اور ہمدردی انہی لوگوں سے اس کو پہنچتی ہے۔ اور ہم عمر لڑتے بھڑتے ہیں بحث اور ضد کرتے ہیں۔ دشمنی سی ٹھان لیتے ہیں۔ بھائی بہن ہو کر ایک دوسرے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ غرض ایک کنواری لڑکی کا تجربہ تو یہ ہوتا ہے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ نہ معلوم کیوں یہ معلوم کرتے ہی کہ ڈپٹی صاحب پوتی پوتا اور نواسی نواسا والے ہیں میرا دل ڈوب سا گیا۔ بہن رفو مجھے ہراساں دیکھ کر بولیں کہ "تو گھبراتی کیوں ہے تو تو کہتی تھی کہ مجھے جیسا بھی میاں مل جائے گا میں خوش ہوں گی۔ اور اس کی خدمت میں عمر تیر کر دوں گی۔ فرماں بردار لونڈی بن کر رہوں گی تجھ کو کیا بڈھا جوان" ٹھیک کہتی ہے میں نے اپنے دل میں کہا۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔۔

میں نے بہن رفو سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر تم خود سوچو کہ لڑکے لڑکیاں پوتے پوتیاں سب کے سب میرے دشمن ہونگے اور پھر خدا نہ کرے۔۔۔۔ آپا زہرہ کی حالت دیکھو بیچاری۔۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر رک گئی۔ آپا زہرہ کتنی اچھی آدمی ہیں، بے چاری جوانی میں بیوہ میاں بالکل بڈھے تھے۔ پانچویں سال ہی مر گئے۔

بہن رفو بولیں "بہن یہ نہ کہو، ہماری پڑوسن کو دیکھ لو۔ دو جوان داماد کھو چکی ہے کیسے ہٹے کٹے تندرست جوان تھے۔ موت جوان اور بڈھے دونوں کو یکساں آتی ہے۔ یہ کوئی بات نہیں"

میں سچ کہتی ہوں کہ مجکو دو روز سے زیادہ خلجان نہ رہا۔ اس کے بعد پھر وہی خیالات کہ میں کس کس طرح دن رات میاں کی خدمت کروں گی۔ کس کس طرح نوکرانیوں کی طرح اس کا کام کروں گی۔ کس کس طرح اس کے آرام کا ہر وقت خیال رکھوں گی! خدا معلوم میرے خمیر میں غلامی بسی تھی جو ہر وقت مجھ کو

یہی خیالات گھیرے رہتے تھے۔ بہت جلد مجھ کو معلوم ہونے لگا کہ جیسے ڈپٹی صاحب سے میرا کوئی روحی تعلق ہے رسماً جو چیزیں تھوڑے دن بعد آئیں ان کو میں دیکھتی اور اندازہ لگاتی کہ دیکھو تو ان کو مجھ سے کس قدر اچھی سے قدری اُنسیت ہے۔ شادی سے آٹھ دس دن پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر کہیں کوئی مجھ سے آکر کہہ دیتا کہ ڈپٹی صاحب مر گئے تو شاید میں کوٹھڑی میں منہ چھپا کر گھنٹوں روتی۔

(۲)

میری شادی نہیں تھی بلکہ محض رسم نکاح تھی۔ کھانا پینا دعوت وغیرہ سب ندارد تیسرے پہر کو ڈپٹی صاحب، دو تین آدمیوں کے ساتھ آئے اور رات کو مجھ کو موٹر پر بٹھا کر بیاہ لے گئے۔ موٹر میں بیٹھتے وقت میں نے ڈپٹی صاحب کی ایک جھلک دیکھی، سردی سے بچنے کے لئے اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے، اور منہ پر ایک ڈھاٹا باندھا تھا جیسے کوئی زخم کو پٹی سے باندھتا ہے۔

رات گئے تک میرے پاس میری سوتیلی بیٹیاں بیٹھی رہیں جو مجھ سے عمر میں کہیں زیادہ تھیں کیونکہ میری عمر اس وقت مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ ان کے علاوہ ڈپٹی صاحب کے اکلوتے بیٹے کی بیوی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہی ان سب نے آپس میں منہ چھپا کر ہنسنا شروع کر دیا تھا چپکے چپکے میرے اوپر یہ سب فقرے چُست کر رہی تھیں، اور پھر اپنے بڈھے باپ کے اوپر بھی ایسے طعن کھینچ رہی تھیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں کٹی جاتی تھی مگر چپ تھی۔

جب یہ چلی گئیں، تو میں تنہا رہ گئی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں رنگ برنگے قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر

طرح طرح کی تصویریں لضب تھیں۔ چھوٹی چھوٹی میزیں رکھی ہوئی تھیں جن پر طرح طرح کے پھول دان رکھے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے رنگین پردے تمام الماریوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔

مجھ کو کسی کے آنے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ کراہنے کی آواز آئی جیسے کوئی سخت تکلیف کی وجہ سے کراہتا ہے۔ میں گھبرا سی گئی کہ یا اللہ یہ ڈپٹی صاحب کو کیا ہوا کیونکہ وہی تھے۔ میں رضائی میں لپٹ کر اپنے کو اچھی طرح چھپا کر بیٹھ گئی۔ بڑی طرح کراہتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئے، وہ درد کے مارے بیتاب تھے آکر وہ دوسری مسہری پر بیٹھ گئے۔ درد بھی کیا بلا ہے۔ وہ درد کی شدت سے گویا تڑپ رہے تھے، مجھے خیال آیا کہ منہ پر ڈھاٹا بندھا ہے وہیں کہیں درد ہوگا۔

ہر کراہنے کی آواز سے میرا دل ہلا جاتا تھا۔ اور بدن کے رونگٹے جیسے کھڑے ہوئے جاتے تھے۔ میں کبھی اتنی پریشان نہیں ہوئی۔ خود خیال کیجیے کہ ایک بیمار درد سے اس طرح تڑپ رہا ہو اور میرے لبوں پر عروسی کی وجہ سے مُہر سکوت! وہ بیقرار ہو کر اٹھے اور دروازہ پر جا کر انھوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ "بیٹی۔۔۔۔۔ بیٹی۔۔۔۔۔ عارفہ۔۔۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔۔۔ ساجدہ۔۔۔۔۔ کمبخت سب مر گئے۔ ارے بولو میں مر رہا ہوں۔"

کسی نے شاید کچھ جواب دیا جو وہ بولے "ڈاڑھ میں درد۔۔۔۔۔ سخت درد ہو رہا ہے۔"

نہ معلوم کیا جواب ملا اور ڈپٹی صاحب اسی طرح تڑپتے ہوئے مسہری پر لیٹ گئے۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ میرے منہ میں زبان نہ تھی کہ بولوں اور جسم میں طاقت نہ تھی کہ حرکت کروں۔ مجھکو ایسی تکلیف کہ بیان نہیں کر سکتی۔ ڈپٹی صاحب بڑی طرح کراہ رہے تھے اور اپنی ناخلف اولاد کو اور اپنی قسمت کو برا کہہ رہے تھے۔ کہ ایک دم وہ بڑی طرح کراہے اور بڑے

زور سے کھانسی کا ایک دم سے دورہ ہوا تڑپ کر وہ اُٹھے۔ مارے تکلیف کے وہ بل کھا گئے۔ زور سے پھندا سا لگا اور بڑے زور سے اُبکائی آئی۔

"ارے۔۔۔ پانی پانی" کہہ کر انھوں نے جو کی تو اس بڑی طرح کہ میں گھبرا کر ایک دم سے اُٹھ بیٹھی۔ لپک کر لوٹا اٹھایا اور گھسیٹ کر سلپچی لی کہ فرش اور نہ بگڑے۔ خدا کی پناہ! وہ کیسی تکلیف میں تھے۔ میں نے کُلی کرائی، اچھی طرح انھوں نے گلا صاف کیا۔ منہ پر ڈھاٹا جو کسا تھا وہ کھولنے لگے، اُگے میں بھر گیا تھا اور گرہ جو لگی تھی وہ نہ کُھلی تو میں نے لوٹا رکھ کر گرہ کھولی۔ اب میں نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا چھوٹی سی ڈاڑھی تھی جس پر خضاب کیا ہوا تھا۔ گورا رنگ تھا چہرہ صاف اور ستھرا مگر جھریاں آنکھوں کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کا رُخسار سوجا ہوا تھا۔ کپڑا کھول کر الگ ڈال دیا۔ قے ہونے سے گویا انھیں سکون سا آ گیا۔ اور وہ جیسے تھک کر مسہری پر لیٹ گئے۔ "مجھے اڑھا دو" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ میں نے ان کو اڑھا دیا تھا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اسی طرح ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے ضعیف شوہر کے آگے بالکل بے حجابانہ کھڑی ہوئی آنکھیں چار کئے ہوں۔ شوہر سے بھلا شرم کاہے کی اور پردہ کیسا مگر پہلی مرتبہ کا احساس مجھ کو بے انتہا شرم آئی۔ منہ چھپانا نہایت بے وقوفی تھی۔ میری نظر خود بخود نیچی ہو گئی۔

چمکار کر انھوں نے کہا "بیٹی۔۔۔ لاحول ولا قوۃ ابیوی۔۔۔ بیگم بیٹھ جاؤ" ذرا سا سرک کر انھوں نے لحاف سرکا کر جگہ کر کے کہا "بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ" مجھ کو بے حد شرم معلوم دی کہ انھوں نے پھر چمکار کر کہا "اور بیٹھ جاؤ" میں پٹی پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے بازو پکڑ کر مجھ کو گھسیٹ کر اچھی طرح بٹھا لیا بڑی محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں نے تمہیں بڑی تکلیف دی" میں نظر نیچی کئے چپ رہی کہ وہ پھر بولے "میں نے تمہیں بڑی تکلیف

دی۔۔۔" میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے "میں تمہیں بہت آرام سے رکھوں گا"

اتنا کہہ کر انھوں نے پھر کہا "اُف!" میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بولے "داڑھ کے درد کے مارے دو روز سے جانکنی کی سی تکلیف ہے اور پھر آج سینے میں سخت درد ہے کمبختوں کو پکار پکار مرا۔ مگر ٹھیک تو ہے کہ وہ کوئی ڈاکٹر تو نہیں لیکن پھر بھی نہ کوئی ملازمہ سنتی ہے نہ کوئی۔۔۔۔ اُف" یہ کہہ کر پھر تکلیف شروع ہوئی ذرا سی دیر میں پھر وہی حالت ہو گئی۔

مجھ سے اب ان کی تکلیف نہ دیکھی جاتی تھی۔ اور میں اٹھی تو انھوں نے کہا "کہاں جاتی ہو؟"

میں نے دبی زبان سے کہا "کچھ تدبیر کروں گی"

"نہیں تم رہنے دو" انھوں نے کہا "کیا تدبیر کرو گی؟"

"ابھی آپ کا درد جاتا رہے گا" میں نے کہا اور کہتے ہوئے دروازے کی طرف چلی جیسے مجھے سب کچھ معلوم ہے کہ کونسی چیز کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔

"جیتی رہو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے" ڈپٹی صاحب کراہتے ہوئے بولے "زینے سے اتر کر سامنے ہی باورچی خانہ ہے۔ آگ ہو سکے تو لانا"

میں دبے پاؤں چپکے سے زینے سے اتر کر باورچی خانے میں پہونچی، روشنی نہ تھی، سامنے کے برآمدہ میں لالٹین رکھی تھی۔ سب طرف سناٹا تھا۔ میں نے چپکے سے لالٹین اٹھائی۔ اور باورچی خانہ میں آکر چولھے کو دیکھا۔ چولھے میں تھوڑی سی آگ تھی۔ میں نے ایک بڑی رکابی میں آگ نکالی کہ مجھے ایک انگیٹھی نظر پڑی ایک برتن میں کوئلے بھی مل گئے۔ میں نے آگ اور کوئلے انگیٹھی میں رکھے۔ اب میں ادھر ادھر دیکھنے لگی اور تلاشی کے بعد مجھے سب چیزیں مل گئیں۔ تھوڑا سا نمک میں نے لے کر موٹا موٹا اس کو چکلہ پر پیسا۔

ایک ہلدی کی گانٹھ لے کر چولہے میں رکھ دی اور تیل تلاش کرنے لگی۔ پوری خانہ تلاشی کے بعد تھوڑا سا تیل ملا، جو کافی تھا۔ ایک تانبے کی رکابی لی۔ اور ان سب چیزوں کو انگیٹھی پر رکھ کر اوپر لائی۔ ڈپٹی صاحب مجھے بڑے رقت آمیز لہجہ میں دعائیں دے رہے۔ میں نے یہ چیزیں رکھیں اور ہلدی کی گانٹھ رکھنے پھر نیچے آئی۔ اس کو دیکھا تو اس میں کچھ تھوڑی سی کسر تھی۔ پھر بھوبل میں داب دی اور منتظر تھی کہ یہ گرم ہو جائے تو نکالوں۔ کہ برآمدہ کی طرف سے آواز آئی "کون ہے!" ..... یہ باورچی خانہ میں کون ہے؟" کسی نے سخت لہجہ میں کہا۔ "ارے یہ کون ہے؟" یہ کہہ کر سید ھا اٹھ کر میری ہی طرف آیا۔ میں نے چولھے کی طرف منہ کر لیا۔ کیونکہ جانتی ہی تھی کہ میرے زرق برق کپڑوں ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔ مردانی آواز میں پھر کہا، مگر ذرا آہستہ سے "تم کون ہو؟" میں سخت گھبرائی کہ میرے ساتھ یہ شرارت کی جا رہی ہے، لالٹین لے کر وہ کمبخت میرے سامنے ہی آگیا اور کہا "اخاہ! جناب ہیں!" یہ کہہ کر میرے منہ پر لالٹین کر کے مجکو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ میرا سوتیلا لڑکا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی تیز بو آرہی تھی۔ اور چہرے پر شیطنیت تحریر تھی "واہ بھئی واہ! ابا جان اماں تو زور کی لائے ہیں....." میں کچھ نہ بولی تو وہ پھر بولا "چھوٹی اماں سلام" میں نہیں بیان کر سکتی کہ میرا کیا حال ہو گیا پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ ایک دم سے وہ قہقہہ سا لگا کر لالٹین لے کر برآمدہ کی طرف یہ کہتا چلا "بڑے میاں کے لیے آگ جا رہی ہے" کسی دوسرے نے اندر سے پوچھا کون ہے؟" وہ بولا "نئی دلہن ہیں" میں نے جو موقع پایا تو ہلدی کی گانٹھ لے کر تیزی سے اوپر چڑھی چلی گئی۔

اوپر پہنچی تو ڈپٹی صاحب مارے درد کے تڑپ رہے تھے اجوں توں کر کے ہلدی کی گانٹھ میں نے دھو پونچھ کر ان کی داڑھ تلے رکھوائی

نمک کی پوٹلی ایک رومال میں باندھ کر ان کا سوجا ہوا منہ سینکا کہیں روئی نہ تھی، مجبوراً ایک تکیہ پھاڑ کر روئی نکالی اور خوب اچھی طرح سینکا۔ گرم تیل کی مالش اور روئی رکھ کر باندھ دیا۔ ڈپٹی صاحب کو اتنا آرام ملا کہ تھوڑی ہی دیر میں ٹھیک ہو گئے۔ مجھے خوب خوب انھوں نے دعائیں دیں لیٹے ہی لیٹے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے سینے پر لٹایا۔ محبت سے انھوں نے میری پیشانی اور رخساروں پر بوسہ دیا اور اسی طرح مجکو دعائیں دیتے اپنے سینہ پر میرا سر رکھے میرے گالوں کو تھپکتے تھپکتے سو گئے۔ بڑی دیر تک میری آنکھ نہ لگی۔ مگر ہل نہ سکتی تھی کہ کہیں جاگ نہ اٹھیں۔ پھر آخر میں بھی اسی طرح پڑی پڑی سو گئی۔

دو ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد ڈپٹی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ میں اس طرح غافل سو رہی تھی کہ انھوں نے اٹھا کر مجھ کو جب تکیہ پر لٹا دیا تب میری آنکھ کھل گئی۔ "لڑکپن کی نیند۔۔۔۔" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور وہ کہتے ہی رہے "سو رہو سو رہو"

صبح تک ڈپٹی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کے بیٹے کی شرارت کا تذکرہ نہ کیا۔ تمام دل کی باتیں انھوں نے مجھ سے کہہ ڈالیں۔ لڑکے کی نالائقی، شرابی کبابی ہے، بدمعاش آوارہ ہے، لڑکیوں کی لاپرواہی کہ کس طرح انھوں نے مجبور کیا کہ نئی شادی کریں۔ کیونکہ کچھ خدمت ہی نہیں کرتیں پھر داما دوں کی خود غرضی کے قصے۔ غرض دنیا کی باتیں کر ڈالیں۔

ان باتوں کے بعد صبح کو میں شاید اپنے کو بہترین شوہر والا خیال کرتی تھی۔ اس سے اچھا شوہر میرے خیال میں ممکن نہ تھا۔ میں خوش تھی بے انتہا خوش تھی کہ خدا جانے کیسا قابل پرستش محبت کرنے والا شوہر عطا کیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ محبت کے کیا جذبات میرے سینے میں موجزن تھے۔

گھر کی بدتمیزیوں کا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کی دونوں جوان لڑکیوں کے شوہر ڈپٹی صاحب کے ایک نالائق بھائی کے نالائق لڑکے تھے اور ان لڑکوں یعنی دامادوں کی بہن لڑکے کو بیاہی تھی۔ یہ سب لوگ ڈپٹی صاحب کے گھر میں روزانہ اس قدر آتے جاتے تھے کہ گویا داماد کیا گھر داماد تھے۔ ہر کسی کی یہی کوشش تھی کہ میں ڈپٹی صاحب سے سب سے زیادہ لے لوں، مہینہ بھر کے اندر ہی اندر معلوم ہو گیا کہ میرا رہنا اس گھر میں ناممکن ہے اور بہت جلد مجھ کو ڈپٹی صاحب نے ایک دوسرے مکان میں رکھا اور خود بھی وہیں رہنے لگے اور اس بڑے گھر کو انھوں نے اولاد کے سپرد کر دیا۔

مجھے کوئی تکلیف نہ تھی۔ دُنیا کی راحتیں میسر تھیں۔ جب کہوں جب سواری حاضر اور گھر ہو آؤں۔ روپیہ پیسہ، غرض دنیا کی چیزیں میرے لیے ڈپٹی صاحب نے مہیا کر دیں۔ مجھکو وہ بے انتہا چاہتے تھے اور یہی حال میرا تھا۔ لیکن اس طرفین کی محبت میں ایک عرصہ بعد ایک عجیب ہی قسم کی تبدیلی سی رونما ہونے لگی۔ وہ تبدیلی کہ جس کا خیال کر کے اب بھی میں اپنی طبیعت پر نفریں کرتی ہوں۔

ڈپٹی صاحب کیا تھے گویا بیماریوں کی پوٹ تھے۔ میں ایسی سبز قدم نکلی کہ میرے آنے کے ساتھ ساتھ ان کا پُرانا مرض دمہ بھی آ گیا۔ گنے چُنے چار چھ دانت تھے وہ الگ دن رات ایذا دیتے تھے۔ بواسیر کی تو شکایت تھی ہی اس کے ساتھ ساتھ ریاحی درد۔ اگر آج سینے میں درد ہے تو کل بواسیر کا خون زیادہ آ گیا۔ دو روز کی مہلت نہ ملنے پائی کہ دانتوں میں درد ہو گیا۔ اس سے مہلت ملی کہ دمہ دم کو نکالے لیتا ہے۔ ہر چیز کھانے کی نقصان کرتی تھی۔ میں نے بھلا یہ بیماریاں کاہکو دیکھی تھیں، دن اور رات کا یہی دستور تھا۔ راتوں سینکتے گذر جاتی۔ دوائیں گھولنے چھاننے کا ایک مرض لگ گیا مگر مریض کو پھر بھی چین نہ آیا۔ لفظ ہائے کے ساتھ لفظ ہوئی

تکلیف میں سوائے میرے ان کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ ایک دن کا ہو دو دن کا ہو کوئی بھگت لے مگر آٹھ پہر کی دوڑ دھوپ اور پریشانی سے بہت جلد میری زندگی وبال ہو گئی۔ میں رات کے جاگنے سے پست ہو جاتی۔ وہ خود محسوس کرتے اور درد بھرے لہجہ میں میری خدمات کا احساس اس طرح فکر کرتے اور شکریہ ادا کرتے کہ میرا دل ہل جاتا

کچھ بیماریوں ہی سے نہیں بلکہ یونہی ڈپٹی صاحب سے اور ان کی باتوں سے طبیعت اُچاٹ سی رہنے لگی اور رفتہ رفتہ مجھ کو معلوم ہونے لگا کہ جوان اور بوڑھے شوہر میں بھی کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ مگر خدا گواہ ہے کہ ان کی محبت میرے دل میں اتنی ہی تھی۔ ذرہ بھر کمی نہ ہوئی تھی۔ میں ان کو اسی طرح چاہتی تھی مگر ان سے دلچسپی کم ہو گئی تھی جو رفتہ رفتہ جاتی سی رہی۔ مجھ کو کھلونا سمجھتے تھے اور اس بری طرح چاہتے تھے کہ وہ حال ہو گیا جیسے کسی ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں بلی کا بچہ ہو جو محض اس لیے کہ بچے کو خوش رکھے اور خود دن رات اس کی دلچسپی کا سامان بنا رہے۔ اور اس کو اپنے کھیلنے والے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ بھلا انسان طبیعت پر کہاں تک جبر کرے چھ مہینے کے بعد ہی اور سال بھر سے پیشتر ہی میں زچ ہو گئی۔ اور تنگ ہو کر منہ سے ایسے لفظ نکلنے لگے "مجھے کمبخت کو چین ہی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اونہہ ۔ ۔ ۔ ہر دم بس انہی کے پاس گھسے رہو۔ بھلا کوئی بات بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے تو بہتر ہے کہ خدا موت دے دے "۔ جب ایسے جملے میرے نکلتے وہ دھک سے ہو جاتے۔ اور میری طرف معصومانہ انداز سے دیکھتے مجھ سے یہ حالت نہ دیکھی جاتی اور ان کو دیکھ دیکھ کر ہنس دیتی۔ بس گویا انھیں جنت سی مل جاتی۔ اور خوش ہو جاتے۔ مگر یہ پارٹ بھی زیادہ دن تک بات بات پر نہ کھیل سکتی تھی۔ صرف موقع بموقع یہ عنایت کرتی۔ خدا کے غضب سے ڈر معلوم ہوتا کہ ضعیف شوہر ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد یہ احساس بھی جاتا رہا۔

خدا کی مار میرے اوپر کہ ان سب مصیبتوں کے ساتھ ساتھ مجھے ماں بننے کی بڑی ہی تمنا تھی۔ خدا نے وہ دن بھی دکھایا۔ اور شادی کے سوا برس بعد میرے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ دونوں لڑکے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صاحب اولاد ہو کر پھر ایسی خوشی۔ شاید میری وجہ سے۔ دو دودھ پلانے والیاں رکھ دیں۔ تاکہ مجھے فرصت رہے۔ دونوں بچے اچھی صورت شکل کے اپنے باپ کے ناک نقشے کے تھے۔

بچے تین چار مہینے کے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ڈپٹی صاحب کا بیٹا اصغر جوان آدمی تھا۔ بد چلن، آوارہ اور شرابی تھا۔ وہی جس نے پہلے ہی روز رات کو مجھے باورچی خانہ میں تختۂ مشق بنایا تھا۔ دوسرے ہی روز اس نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی۔ اور بڑی لڑکی نے مجھے چپکے سے سمجھا دیا تھا کہ نشے میں یہ حرکت ناشائستہ کر بیٹھا تھا۔

بیٹے کو دن رات روپے کی ضرورت پریشان رکھتی تھی اس کو کچھ مقررہ ملتا تھا اور کچھ وہ زمینداری کی آمدنی میں مار لیتا تھا۔ مگر پھر بھی روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ اس نے اب اور ترکیب چلی اور یہ کہ میری طرف توجہ کی۔ ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ میری اولاد سے تم صلح سے رہو تو بہت اچھا ہے تاکہ میرے بعد تمہیں تکلیف نہ ہو۔ لہٰذا ڈپٹی صاحب کی مرضی یہ تھی کہ اگر وقت بے وقت اس کو روپے پیسے کی ضرورت پڑے اور ان سے وہ مانگے تو وہ انکار نہ کرے اور مجھ کو روپیہ دے دیں اور میں اس کو دے دوں تاکہ وہ سمجھے کہ سوتیلی ماں نے چپکے سے دیا ہے۔ باپ نے نہیں دیا ہے۔ دو ایک مرتبہ جو ڈپٹی صاحب نے اس طرح مجھ سے روپیہ دلوایا تو وہ یہی سمجھنے لگا کہ ڈپٹی صاحب سے چھپا کر میں اس کو اپنے پاس سے دے رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے کتنا خوش ہوگا۔ ڈپٹی صاحب جو کپڑوں کیلئے اس کو

یا اس کے بیوی بچوں کیلئے دیتے وہ اس کو کھا پی کر برابر کرتا۔ ڈپٹی صاحب نہ دیتے تو مجھ سے کہتا کہ "دلہن بیوی میرے بچوں کے پاس کپڑے نہیں ہیں" میں ڈپٹی صاحب سے کہتی اور وہ مجھے دیدیتے کہ چپکے سے دے دینا۔

اسی سلسلہ میں وہ مجھے بھی راضی رکھنے کی انتہائی کوشش کرتا۔ اور میں بھی اس کا بیحد خیال کرتی۔ اگر وہ آتا اور کوئی عمدہ چیز پکتی تو ضرور اس کو فرض کر کے کھلاتی۔ اور جتا دیتی کہ "اصغر! یہ تمہارے لیئے میں نے پکائی ہے" ڈپٹی صاحب دل ہی دل میں خوش ہوتے کہ بیٹا سوتیلی ماں سے اس قدر محبت کرنے لگا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اطمینان سے کہتے کہ "مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ ہے کہ اگر تم نے اسی طرح اصغر کے ساتھ برتاؤ رکھا تو میرے بعد تمہیں اصغر کوئی تکلیف نہ ہونے دیگا"

ڈپٹی صاحب کو پچیسی کھیلنے کا بیحد شوق تھا۔ مجھ سے تو چونچلے کے مارے وہ ایسے کھیلتے تھے کہ کچھ دلچسپی ہی نہیں آتی تھی کیونکہ جان بوجھ کر مجھ سے ہارتے اور وہ بھی اس طرح کہ کھیل کا سب لطف ہی جاتا رہتا۔ پھر ایسی صورت میں بھلا ان کے ساتھ کیا جی لگتا۔ اصغر بھی پچیسی اکثر کھیلنے آتا تھا۔ اور اس سے پچیسی کھیلنے میں میرا جی لگتا تھا۔ کچھ تو بے تکلفی تھی ہی اور کچھ کھیلنے کے سلسلے میں ہو گئی۔ میں اس سے مہر و محبت سے نہ معلوم کس وجہ سے پیش آتی تھی۔ اور وہ نہ معلوم کیا سمجھا۔ شیطان جب کسی کو انگلی اٹھا دیتا ہے تو اس کی آنکھوں کے آگے پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ نامراد ناخلف میری مہربانیوں کے کچھ اور ہی معنی لینے لگا۔ اور ایک روز اس کی باتوں سے اور اس کی نظروں سے میں ایسی پریشان ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اتفاقاً کمرے میں میں اور وہ دونوں اکیلے ہی تھے اور اس کی ذومعنی باتیں کہ پچیسی میں میں نے اس کی گوٹ ماری تو اس نے کہا "مار ڈالا مار ڈالو...... ظالم ہو، وغیرہ" اور پھر اس کی نظریں بھی سراسیمہ سی ہو گئیں۔ اور میرے اوپر نہ معلوم کیسی خاموشی اور شرم طاری

ہوگئی کہ اتنے میں ملازمہ آگئی، اور میری جان چھوٹی۔ میں درد سر کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور سخت پریشان تھی کہ یا الٰہی کیا کروں۔ اگر ڈپٹی صاحب سے کہتی ہوں تو بُرا۔ اور اگر نہیں کہتی ہوں تو مُصیبت!

میں اسی شش و پنج میں تھی کہ اس موذی نے اس واقعے کے دو چار روز ہی بعد مجھ سے نہایت بے حیائی سے اظہار تعشق کر ہی دیا۔

غصہ کے مارے میرا برا حال ہو گیا۔ اور میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا: "اصغر! اصغر! ہوش میں آؤ کہاں ہو؟ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارے باپ کی بیاہتا بیوی..... ہیں ہیں یہ کیا"... مگر وہ تو دیوانہ سا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم خود مجھے چاہتی ہو..." یہ کہہ کر کمبخت نے مجھے زور سے اپنے آغوش میں لے کر دبا لیا۔ اس کے نجس ہونٹ میرے رخساروں پر لگے تھے کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گئی۔

دن بھر میں ملول اور مغموم رہی۔ اور یہی سوچتی کہ کس طرح ڈپٹی صاحب سے کہوں۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور بہت کمزور ہو رہے تھے۔ میں ڈر رہی تھی کہ شمع سحری تو ہو ہی رہے ہیں کہیں صدمے کے مارے مر نہ جائیں۔ یہ سوچی کہ ذرا طبیعت سنبھل جائے تو کہوں۔

اس واقعہ کے تیسرے ہی دن مجھ کو ملازمہ نے ایک کاغذ لا کر دیا۔ یہ خط تھا جو اصغر نے مجھ کو لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ "اگر تم نے شکایت کی تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری جان کی خیر نہیں ہے اور تمہارے دونوں بچوں کو مار کر ٹھکانے لگاؤں گا اور یہ بھی کہہ دوں گا کہ کس طرح سمیع سے چھپ چھپ کر ملتی ہو۔"

خط پڑھتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ الٰہی خیر کیجیو۔ اگر خط دکھاتی ہوں تو ڈپٹی صاحب کہیں گے کہ یہ سمیع والا جھگڑا کیا ہے۔ سمیع ڈپٹی صاحب کا

چھوٹا داماد تھا۔ گویا وہ مجھے یہ الزام دے کر اپنی بریت تلاش کرتا تھا۔ سمیع بھی میرے پاس اکثر جایا آیا کرتا تھا۔ میں سر پکڑ بیٹھ گئی کہ یا اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی۔

اس خط کے دوسرے ہی دن مجھے ایک خط اور ملا اور اس میں بھی تمام دھمکیاں ہی تھیں اور طرفہ یہ کہ لکھا تھا سمیع والے قصے کے لیئے دو گواہ بھی موجود ہیں۔ میں پھر چپ ہو رہی، اور اس کے تیسرے ہی روز سے اصغر پھر آنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اب میری روح اس سے کانپتی تھی۔ اور بہت جلد ڈپٹی صاحب کو بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ جب انھوں نے بہت پوچھا تو میں نے صرف اتنا کہا کہ مجھے اصغر سے ڈر لگتا ہے۔ میں نہ سمجھا سکی کہ اس ڈر کی کیا وجہ ہے۔ شاید وہ خود سمجھ گئے ہوں اور کچھ شبہ ان کے بھی دل میں گذرا ہو کہ خدا خدا کر کے اصغر کا آنا جانا کم ہوا، مگر میرے پیچھے اب دوسری مصیبت لگ گئی۔ یعنی کمبخت نامراد سمیع لگ گیا۔ اصغر نے تو جھوٹ ہی کہا تھا لیکن سمیع بھی انہی حرکات پر اتر آیا۔ اتنی ہمت تو سمیع کی نہ پڑی جتنی اصغر کی۔ اور بہت جلد وہ میری دھمکی میں آ گیا۔ مگر اب میری حالت یہ تھی کہ دو موذی میری عزت آبرو کی تاک میں تھے۔ سمیع کا شبہ تھا کہ اصغر سے میرا ساز باز ہے۔ اور اصغر کو شبہ ہو گیا کہ سمیع کے ساتھ میں ساز باندھتی ہوں خدا کی پناہ میں کانپتی تھی کہ الٰہی میں کس مصیبت میں پڑ گئی۔ کیا زمانہ آ گیا کہ ناں کو تکنے لگا۔ نہ میرا اصلاح کار کوئی نہ تھا نہ مشیر۔ کس سے صلاح لوں اور کہاں جاؤں۔ لے دے کے ایک ڈپٹی صاحب تھے جو بالکل چراغ سحری ہو رہے تھے اور مجھ کو وہ دن دور نہ دکھائی دیتے تھے جب میرے اوپر مصیبت پڑے گی۔

قصہ بہت طولانی ہے، بہت دردناک ہے۔ اب مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہو

کہ جیسے ایک خواب پریشاں تھا سازشیں اور دغابازی۔ قدم قدم پر میرے لیے دوزخ تھا میرا سمیع اور اصغر کی طرف سے غیر معمولی کھچاؤ اور پھر ڈپٹی صاحب کا شبہ اور چاروں طرف کے بدگوؤں کی زبان درازی، نوبت اس درجہ پہونچی کہ اٹھنے بیٹھنے والوں کے منھ تک اصغر کا قصہ چلنے لگا۔ جو سنتا مجھ کو نفریں کرتا۔ ڈپٹی صاحب بیمار تھے ان کی عقل ٹھکانے نہ تھی میری قسمت کہ وہ میری وجہ سے اس دنیا سے بیزار ناشاد کام رہنے لگے۔ ان کو میرے اوپر اعتبار رہتا مگر اس قضیے کا وجود ہی باپ بیٹوں میں دشمنی اور باپ کی ہلاکت کا باعث ہوا۔ میری موجودگی میں وہ تمام ان کے شکوک رفع ہو جاتے۔ مجھ سے الگ ہوتے تو سب شکوک بالکل اسی جگہ۔ رہ رہ کر مجھ سے کہتے آخر تم نے اتنے دن معاملہ چھپایا کیوں۔ کیوں نہ تم نے مجھ سے پیشتر ہی کہہ دیا۔

ان پیچیدگیوں اور بیماری کی پیچیدگیوں نے انھیں بہت جلد ختم کر دیا۔ مرنے والا آخری سانس تک یہی سمجھا کیا کہ میں ابھی نہیں مر رہا ہوں ان کو اپنی زندگی بڑی پیاری تھی۔ اور ان کو اپنی موت کا یقین ہی نہ ہوتا۔ ان کی متنوع بیماریوں کی وجہ سے وہ ہو گئی تھی کہ جیسے روزانہ موت بکرے کی طرح گرا کر چھری گردن پر رکھتی تھی۔ ڈر نکل گیا تھا۔ ایک دن آخر کو چھری پھیر ہی دی۔

ڈپٹی صاحب کی موت میری موت تھی۔ انتہائے غم کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی میرا برا حال تھا۔ اماں جان کہیں اگر نہ ہوتیں تو نہ معلوم کیا ہو جاتا۔ ڈپٹی صاحب مرحوم کا جنازہ بھی نہ اٹھنے پایا کہ اصغر گھر میں گھس پڑا۔ سمیع اور اصغر میں فوجداری ہوتے ہوتے بچی۔ سارا گھر دونوں نے مل کر لوٹ لیا۔ ہاتھ کے چھلے تک اتروا لیے اور یہ سب بے خبر کیا۔ جبر کی بھی ضرورت

پیش نہ آئی کیونکہ میں صدمے کی ماری بڈھے شوہر کے لاشے پر رو رہی تھی۔ اور میری تمام دولت وہی تھا جب وہی نہ رہا تو پھر کیا۔

مجھے عدّت کے دن بھی شوہر کے گھر میں پورے کرنے نصیب نہ ہوئے بچّوں کی جان کا کھٹکا لگا ہوا تھا کیونکہ ان دونوں کو اصغر اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔ سوائے اس کے دوسرا ولی نہ تھا۔ سب ہمدردوں نے یہی صلاح کی کہ اپنے گھر بچّوں کو لے کر چلی جاؤ۔ اصغر نے عزیز رشتہ داروں کے کہنے سے وعدہ کیا کہ سو روپیہ مہینہ دیا کروں گا۔ اور ایک مہینہ کا پیشگی بھی دیدیا۔ اور میں اپنے گھر چلی گئی۔ اب گھر پر سوائے میرے اور ماں کے کوئی بھی نہ تھا۔ باپ کا پیشتر ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اور ماں بیچاری نہ معلوم کس طرح غربت میں اپنے دن اکیلی کاٹ رہی تھی۔ ان کی حمیت نے کبھی گوارا نہ کیا کہ میرے گھر آ کر رہیں۔ حالانکہ ڈپٹی صاحب نے اور میں نے ان سے بہت کہا۔

دوسرے ہی مہینے سے اصغر نے کہہ دیا کہ روپیہ نہیں ہے۔ مشکل سے تھوڑا تھوڑا دیتا اور دوسرے اخراجات کا بہانہ کر دیتا۔ اور پھر مجھ سے کہتا گھر چل کر رہو۔ انتہا یہ ہوئی اس نے خرچہ بالکل روک دیا۔ میرے پاس خفیہ طور پر سات سو روپے تھے۔ اور لوٹے گھوٹے پر بھی ہزار بارہ سو کا زیور تھا۔ میں نے دونوں بچّوں کی کھلائیوں کو جس طرح بھی بن پڑا رکھا اور آرام سے رکھا۔

لیکن مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اماں جان بھی شاید میرے بیوہ ہونے منتظر تھیں۔ اور میرے بیوہ ہونے کے سات مہینے بعد وہ بھی چل دیں۔ اب صرف میں اور میں دونوں بچّوں کی کھلائیاں رہ گئیں۔

بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ میری عزت اور آبرو سب کچھ خطرے میں ہے،

میں گھر کو چھوڑ کر اپنے ماموں کے ہاں چلی گئی جو دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ بدبختی سے میری ماں کا کوئی سگا بھائی زندہ نہ تھا۔ اور یہ ماموں میری کے چچا کے بیٹے تھے۔ ماموں خود آکر مجھ کو لے گئے۔ مجھ کو بڑی محبت اور شفقت سے رکھا ممانی بھی اچھی طرح پیش آئیں۔ لیکن ممانی کی محبت عارضی تھی۔ میرے لیے گھر دوزخ بن گیا۔ مہر کا دعویٰ کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ میرا مہر دس ہزار روپے کا تھا۔ مگر میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ اگر مقدمہ لڑاتی تو بچوں کی پرورش کدھر سے ہوتی۔ ادھر ماموں میرے نکاح کی فکر میں لگے اور یہ اور مصیبت رونما ہوئی۔ میری عمر سترہ ساڑھے سترہ برس کی تھی۔ اور مجھ کو خود معلوم ہوتا تھا کہ مجھ کو نکاح کرنا پڑے گا لہٰذا میں چپ رہی اور دیکھتی رہی کہ ماموں کیا کرتے ہیں۔ ماموں اپنے ایک ملنے والے سے میرا نکاح طے کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مقدمہ بھی جب ہی کامیابی کے ساتھ لڑ سکے گا۔ جب میرے نکاح کا معاملہ سب طرح طے ہو گیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ میرے منگیتر ایک بڈھے مختار ہیں۔ بس میں نہیں سکتی کہ میرا کیا حال ہوا ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ ایک مصیبت سے تو چھٹکارا نہیں ملا تھا کہ دوسری سر پر۔ کس قدر خوش آیند میری زندگی تھی۔ نہ معلوم لوگوں نے سوچ کیا رکھا ہے۔ کیا میں دس پندرہ نکاح کروں گی؟ آئے دن مرتے جائیں گے اور میں بڈھے کرتی جاؤں گی میں تو ہرگز ہرگز نہ کروں گی۔ ایک سرے کروں گی ہی نہیں۔ آخر مجھے ضرورت ہی کونسی ہے۔ میرے دو لڑکے ہیں انہی کی خدمت بہت ہے۔ چنانچہ خوب اچھی طرح میں نے سوچ سمجھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اب قطعی شادی نہ کروں گی۔ لیکن ادھر تو میرا یہ ارادہ اور ادھر میں دیکھ رہی تھی کہ میرے نکاح کا انتظام ہو رہا ہے۔ میری دانست میں وہ لوگ جو آپ کو عقد بیوگان کا حامی کہتے ہیں بیواؤں کے لیے پوری مصیبت ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس مخمصے سے رہائی حاصل کروں۔ میں نے پھر اچھی طرح سوچا اور خوب سوچ بچار کر

ارادہ پختہ کر کے ایک روز ممانی صاحبہ سے خود تذکرہ لے بیٹھی۔ پھر صاف صاف میں نے کہدیا کہ میں نکاح وغیرہ کچھ نہیں کروں گی۔ اور یہ سب تیاریاں بیکار ہیں۔ ممانی نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ وہ بولیں "بیٹی پھر تمہیں یہ ساری عمر مع بچوں اور ملازموں کے کھلائے گا کون؟ آج کو تمہارے ماموں ہیں اور کل کو؟"

اب میری آنکھیں کھلیں اور میں نے سوچا کہ کہتی تو سچ ہیں۔ اب بتایئے کہ میں یہ کیسے کہتی کہ میں ایسا نکاح نہیں چاہتی کہ کل پھر بڈھا مر جائے اور میں تیسرا ڈھونڈھتی پھروں۔ میں نے مجبوراً یہ کہا کہ جو بھی قسمت میں ہوگا دیکھا جائے گا مگر میں نکاح تو اب نہ کروں گی۔ مگر ممانی بھی پرلے درجے کی نبض شناس ہیں، وہ کہنے لگیں کہ تمہارے ماموں نے تو کوشش کی تھی کہ کوئی بھلامانس شریف برسر روزگار کنوارا ہی مل جائے یا پھر کوئی تمہاری عمر کا ہی ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ بیواؤں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ پھر بچے والیوں کو تو اور بھی کوئی نہیں پوچھتا" یہ کہہ کر انھوں نے مجھے سمجھایا بجھایا مگر میرے پاس تو ایک نہیں تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں نہیں مانتی تو وہ کچھ بگڑ سی گئیں اور بولیں "غضب کرتی ہو، سب بات پختہ ہو چکی ہے۔ تمہارے ماموں سن بھی پائیں گے تو گھر سر پر اٹھالیں گے"

مگر میں تو اب ایسے ایسے غضبوں اور اندھیروں سے ڈرنے والی نہ تھی۔ میں نے کہہ دیا اور صاف کہدیا کہ خواہ غضب آئے خواہ اندھیر آئے میں جان بوجھ کر اسی مصیبت میں نہیں پڑوں گی۔ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ہرگز نکاح نہ کروں گی۔

اب لطیفہ سنیئے! میرا تو ادھر یہ ارادہ اور ادھر ماموں صاحب نے جیسے سنا ہی نہیں۔ کانوں میں روئی دے لی۔ اور ممانی سے کہہ دیا کہ "بکتی ہے

دیوانی ہو گئی ہے!"

بالآخر نوبت باینجار سید کہ میں نے کھلم کھلا دیکھ لیا کہ میری شادی زبر دستی ہونے والی نہیں بلکہ ہو رہی ہے۔ اب میرے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ماموں کے گھر سے منہ کالا کر جاؤں۔ مگر سوال یہ تھا کہ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ زمین سخت اور آسمان دور۔ وہ مضمون میرا تھا میں کہہ چکی ہوں کہ میری انائیں تھیں اور وہ دونوں کبھی یہاں تھیں چنانچہ ان میں سے ایک میری سچی ہمدرد اور بڑی خدمت کرنے والی تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر آپ چاہیں تو میرے گھر چلی جائیں۔ بات چیت کے بعد یہ طے ہوا کہ تو اپنے بھائی کو تار دیدے اور میں گھر سے چپکے سے اس کے ساتھ مع اپنے بچوں اور اناؤں کے نکل بھاگوں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیونکہ ممکن ہو گا۔ مگر دونوں اناؤں نے کہا کہ آپ کا نکلنا ہے اور ہم دونوں تو نکل جائیں گے۔

چنانچہ یہ بات پختہ ہو گئی اور اس نے اپنے بھائی کو تار بھی دیدیا اور وہ بھی آگیا۔ مگر اب موقع نہ ملتا تھا۔ آخر ایک رات کو مجھے موقع مل گیا۔ کنڈی کھولکر میں انا کے ساتھ باہر نکلی۔ رات کے کوئی دو بجے ہونگے۔ بھائی اس کا باہر کھڑا تھا بچہ اندر سو رہا تھا طے یہ ہوا کہ میں اس کے بھائی کے ساتھ جاؤں اور وہ دونوں پیچھے سے اسٹیشن پہونچ جائیں۔ گاڑی صبح چار بجے جاتی تھی۔ میرے پاس ایک لوٹا، ایک چھوٹی سی پوٹلی کے علاوہ کچھ نہ تھا جس میں نقدی اور مختصر زیور تھا۔

اسٹیشن پہونچی اور راہ تکتے تکتے گاڑی آگئی۔ مگر انا کوئی بھی نہ آئی مجھے ہر دم ڈر لگا تھا کہ کہیں ماموں کو خبر نہ ہو جائے اور پکڑی نہ جاؤں۔ قصہ مختصر گاڑی آگئی اور میں اپنی انا کے بھائی کے ساتھ روانہ ہو گئی بچوں کی طرف سے مجھے پورا اطمینان تھا۔ کیونکہ غیر جگہ تو آخر تھے نہیں۔ میں جانتی تھی کوئی

تکلیف نہ ہوگی۔

ادھر تو میں رفوچکر ہوئی اور ادھر کا حال سنیئے۔ اناّ میں بیچاریاں دونوں بے خطا تھیں بچوں نے رونا شروع کیا اور جاگ ہوگئی۔ وہ تو خیریت گذری کہ رات کو مجھے کسی نے نہیں پوچھا کیونکہ میں نیچے سوتی تھی اور ماموں ممانی اوپر۔ پھر ممانی نیچے آئیں اور میری چارپائی خالی پائی تو اناّ نے کہدیا کہ پاخانہ گئی ہیں۔ وہ فوراً چلی گئیں، اور اس وقت تک مجھے موقع مل گیا۔

صبح ہوئی تو راز کھلا۔ ماموں نے بجائے شور غل کے اپنی ناک کی وجہ سے کہہ دیا کہ چپ رہو اور فوراً یہ قصہ گھڑ لیا گیا کہ سوتیلا بیٹا آکر مجھے سسرال منا کرلے گیا ہے۔ دراصل اس دوران میں وہ آیا بھی تھا مگر میں نہ گئی تھی چنانچہ تیسرے ہی روز وہ میرے دونوں بچوں اور اناؤں کو لے سسرال پہونچے اور اصغر کے سپرد کر آئے۔ مجھے یہ سب کچھ بہت بعد میں معلوم ہوا۔

سفر میں کوئی غیر معمولی بات پیش نہ آئی۔ سوائے اس کے کہ سخت گرمی تھی اور اناّ کا بھائی جس کا نام محمد تھا مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا۔ کئی کئی اسٹیشن نہ آتا تھا۔ گرمی کا زمانہ۔ پانی کی سخت تکلیف تھی۔ کس کس طرح میں پانی والے کو پکارتی مگر کوئی نہ سنتا تھا۔

ایک اسٹیشن پر میں نے دیکھا کہ دو شخص باتیں کرتے چلے جارہے ہیں۔ ان میں ایک صاحب انگریزی کپڑے پہنے اپنی انگلی میں ٹوٹی ہوئی چاء کی پیالی کا کنڈا پہنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے ایک لڑکی نے دو مرتبہ پوچھا کہ یہ کیا پہنے ہیں۔ میں نے اس سے کہا "چینی کی انگوٹھی پہنے ہیں" بس میرے اس کہنے پر دونوں نے مجھے غور سے دیکھا تو میں جھٹ سے کھڑکی کی آڑ میں ہوگئی۔

اس کے بعد ایک اسٹیشن پر جبکہ میں پانی کے لیئے بے چین ہورہی تھی

اور لوٹا لٹکائے کھڑکی سے گردن نکالے پانی والے کو پکار رہی تھی۔ عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ پیچھے سے آکر کسی نے اس برجستگی سے میرا لوٹا میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ جب میں نے لوٹا لے لیا تب مجھے پتہ چلا کہ کیا ہوا۔ ایک نظر میں نے دیکھا، یہ ان کا ساتھی تھا جو چینی کی انگوٹھی پہنے ٹہل رہے تھے۔ گاڑی ایک دم سے چل دی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ٹھنڈا پانی میں نے پیا۔ لوٹے کو میں نے دیکھا، لوٹے کے مالک کا نام کس خوبصورتی سے لوٹے پر کندہ تھا کہ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ علاوہ نام کے پتہ بھی تھا۔ اور پتہ بھی بورڈنگ کا۔ مجھے معلوم ہوا کہ لوٹے والے صاحب کوئی طالب علم ہیں اور واقعی صورت شکل سے بھی طالب علم معلوم ہو رہے تھے۔ اچھا لانبا قد تھا۔ گندمی یا گورا رنگ۔ کوئی بیس بائیس سال کی عمر ہوگی۔ سرخ ٹوپی پہنے کتھئی رنگ کی شیروانی پہنے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگلے اسٹیشن پر آکر اپنا لوٹا لے جائینگے مگر وہ تو بدل کر ایسے غائب ہوئے کہ پھر دیکھنے ہی میں نہ آئے۔ حتیٰ کہ میں گاؤں میں پہونچی، یعنی اپنی انا کے گھر۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری انا ذات کی دُھنی ہے۔ حالانکہ وہ شیخ بتاتی تھی۔ اب یہاں آکر قبل اس کے کہ میں سوچوں کہ کیا کروں گی۔ ایک نئی مصیبت کا دور شروع ہو گیا۔

میری انا کے بھائی کی عمر کوئی تیس بتیس برس کی ہوگی۔ میری ہم عمر اس کی بیوی بھی تھی اور ماں بھی تھی۔ اور لطف تو دیکھئے کہ ادھر میں گھر میں اتری ہوں اور اس کی بیوی جوتی لے کر میرے سر پر۔ میں نے ایسی لڑاکا، ایسی ضدن، ایسی فسادن عورت ہی نہیں دیکھی۔ اتنی تڑہی، اتنی بدزبان اور اور اتنی گالیاں دینے والی عورت میں کر دیکھنے میں نہیں آئی۔ مجھے اس

نے غور سے دیکھا۔ بڑبڑاتی چلی گئی اور اپنی کوٹھڑی میں جاکر اس نے پہلے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی لیکچر شروع کیا۔ لیکن بہت جلد ہی کوٹھڑی سے کوسنے، گالیوں اور مغلظات کا ایک سیلاب جاری ہو گیا۔ لاکھ میاں سمجھاتا ہے۔ اساس سمجھاتی ہے۔ میری امارت کا ذکر کر کے اور آقا ملازم کے رشتے کا تذکرہ کر کے مجھے قابل احترام بتایا جاتا ہے۔ مگر توبہ کیجیے۔ وہ تو ایک بلا ہے جو کسی کے قابو نہیں آتی۔ نتیجہ یہ کہ گھنٹہ بھر کے اندر اندر اس نے مجھے سوت کا پاک لقب دے کر تحریک عدم تعاون کا آغاز کر دیا۔

شام نا فرجام آ گئی ہے تو مجھے خود چولہے میں جھکنا پڑا۔ کیونکہ گھر والی نے عدم تعاون شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ بھی مجھے گوارا تھا۔ مگر دوسرے روز اس نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب یہ مجھے مارے گی۔ نتیجہ یہ کہ پڑوس کی ایک جولاہی کے گھر میں مجھے پناہ ملی۔

بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ محمد کی بیوی کی ہائے ہو سب حق بجانب تھی۔ کیونکہ آپ یقین مانیں کہ محمد نے سچ مچ مجھ سے نکاح کی تمہید اٹھائی۔ اور وہ بڑھیا جلاہنی قطامہ پیغامبر بن کر آ گئی۔ یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اور غنیمت ہوا کہ میں نے بڑھیا کو مارا نہیں۔ مگر اس کے تیسرے دن بڑھیا نے مجھے نوٹس دیا کہ تو مکان خالی کرو اور چلتی پھرتی نظر آؤ ورنہ نکاح کرو۔ ہیں!! اب میری آنکھیں کھلیں۔ میرا روپیہ اور زیور سب محمد کی سپردگی میں تھا۔ اب میں کیا کروں؟ یہ سوال تھا۔ بڑھیا نے ایسے گول گول دیدے نکالے ہیں کہ بیان سے باہر۔ اور بگڑ کر مجھ سے کہا کہ نکلو یہاں سے۔ میں نے محمد کو بلوایا تو وہ ندارد۔ اب مجھے ایک نئی سوجھی۔ شام کو میں محمد کے گھر پہونچی۔ محمد نہ تھا۔ بڑھیا نیم کے نیچے لیٹی تھی اور محمد کی بیوی روٹی پکا رہی تھی۔ میں نے پہونچتے ہی اس سے کہا کہ "تیرا میاں مجھ سے زبردستی شادی کیے لیتا ہے اور میں راضی نہیں۔ تو میری مدد کر ورنہ میری شادی تیرے میاں کے ساتھ

ہو جائے گی۔

وہ کمبخت ٹھٹکنی لے کر اٹھی۔ شاید سمجھی نہیں۔ اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر مُنہ بند کیا۔ اور اُسے سمجھایا تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے پھر کہا تیرا میاں مجھ سے زبردستی شادی کر رہا ہے تو دانت پیس کر بولی کہ میں تجھے مار ڈالوں گی۔

میں نے کہا "اری نیکبخت تو کسی سے میرے ماموں کو تار دیکے بلوادے کہ مجھے آکر لے جاؤ" کچھ کچھ وہ سمجھ گئی اور میں نے اُسے پھر سمجھایا کہ "میں تیرے میاں سے شادی نہیں کرنا چاہتی مگر وہ زبردستی کر رہا ہے اور تو مجھے بچا اور میرے ماموں کو تار دلوادے کسی سے۔ تو نے مجھے گھر سے لڑ کر نکال دیا اور میں اکیلی رہ گئی تو تیرا میاں مجھ سے اب زبردستی شادی کرے لیتا ہے"

یہ سُن کر تھوڑی دیر تک تو اس نے کچھ سوچا۔ اس کی سمجھ میں کچھ آگیا مجھ سے تو اس نے کہا تم روٹی پکاؤ میں ابھی آتی ہوں۔ چنانچہ میں روٹی پکانے بیٹھ گئی اور وہ باہر چلی گئی۔

اب میں سوچ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کہاں سے دام لاؤں جو تار دلواؤں اور پھر یہ سوچی کہ ماموں تار پاتے ہی آجائیں گے اور آکر لے بھی جائیں گے۔ لیکن پھر وہی شادی نہ کروں گی۔ ہرگز ہرگز نہ کروں گی۔

اتنے میں وہ واپس آئی اور مجھ سے رازدارانہ لہجہ میں کہا "لاؤ جلدی لاؤ کیسے تار دلواؤ گی؟"

اب پنسل اور کاغذ کی تلاش ہوئی۔ وہ پھر دوڑی گئی اور نہ معلوم کہاں سے ایک سوکھی ہوئی دوات اور قلم لائی اور ایک ٹکڑا کاغذ کا۔ میں نے تار کا مضمون اردو میں لکھا اور ماموں کا پتہ لکھا۔ تار کا مضمون یہ تھا کہ خدا کے واسطے جلد ہی آؤ۔ میں مصیبت میں پھنسی ہوں۔ ایک بہشتی تھا۔ اُسے یہ بُلا لائی تھی۔ میں نے اچھی طرح اُسے سمجھا کر کہا کہ اسٹیشن جا کر تار دینا اور بابو انگریزی بنا

بنا دے گا۔ اب اس کے بعد روپے پیسے کا سوال آیا تو میرے پاس بھلا روپیہ پیسہ کہاں۔ محمد کی بیوی نے خود دو روپے نکال کر دیئے اور کہا کہ تمہارے ماموں آئیں گے تو تم سے لے لوں گی۔ دراصل وہ مجھے خود دفان کرنا چاہتی تھی بہشتی کو ایک روپیہ کا علاوہ لالچ دے کر میں نے روانہ کیا میری انگلیوں میں ابھی انگوٹھیاں اتنی مالیت کی ضرور تھیں۔ اور میں نے انگوٹھی دکھا کر کہا کہ اگر تو میرا کام کر دے گا تو میرے پاس پچاس ساٹھ روپے کی مالیت ہے غرض بہشتی کو روانہ کیا۔

اس کے بہت دیر بعد بڑھیا آئی اور تھوڑی دیر بعد محمد بھی آگیا۔ مجھے اپنے یہاں اور ایک طرح خود اپنی بیوی کی نگرانی میں دیکھ کر کچھ چکرایا اور ادھر میں نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اتنے میں خود اس کی بیوی اس کی جان کو آگئی۔ میں تو چپ ہو رہی اور اس کی بیوی نے اب اس سے لڑنا شروع کیا۔ خدا کی پناہ! میں نے ایسی لڑائی کا ہیکو دیکھی ہوگی۔ طرفین سے خوب گالیاں دی گئیں اور نتیجہ یہ کہ محمد نے بیوی کو مارنا شروع کیا۔ اور خوب ہی تو مارا۔ مگر وہ خدا بندی بھلا کب دبنے والی تھی۔ اس نے غصہ میں آکر چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ لطف اس لڑائی کا ایک اور تھا۔ وہ یہ کہ مجھے گالیاں دے دے کر میری طرفداری کر رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی کہ میں تجھے اس سے ہرگز نکاح نہ کرنے دوں گی۔ حتیٰ کہ محمد کو اب دوبارہ تکلیف گوارا کرنی پڑی اور اب کی مرتبہ اس نے اسے اُدھیر کر رکھ دیا۔ بہت مارا۔ جب خوب پٹ لی تو بالکل سیدھی ہوگئی اور اب وہ مجھ سے مشورہ طلب کرنے لگی کہ کیوں نہ میں اپنے بھائیوں کو بلوا کر اپنے میاں پٹواؤں۔ اس نے کہا کہ میرے پانچ بھائی ہیں اور سب اس سے ڈگنے بگڑے ہیں۔ میں کیا بھلا مشورہ دیتی۔ محمد نے جواب بیوی کو دبا ہوا دیکھا کہ نکلو گھر سے اور جاؤ اسی بڑھیا کے یہاں۔ میں بھلا اب کا ہیکو جاتی

والی تھی۔ میں نے کہنی سے محمد کی بیوی کو ٹھوکا دیا۔ میں نے کہا کہ اگر میں وہاں گئی تو یہ ضرور مجھ سے شادی کرے گا۔

پھر لڑائی ہوتے ہوتے بچی۔ مگر میں نہ گئی ہم دونوں الگ اور محمد الگ رہا۔

تیسرا روز ہوتے آیا اور ماموں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ مگر تیسرے روز ایک اور نیا شگوفہ کھلا۔ محمد کی بیوی نے بیچ بیچ اپنے بھائیوں کو اطلاع کروا دی تھی۔ اور دو تگڑے تگڑے بھائی آن موجود ہوئے۔ اور اپنی بہن سے ملتے ہی انہوں نے محمد کو مارنا کوٹنا شروع کیا۔ محمد کی بیوی بھی لپٹ پڑی اور اس چپقلش میں محمد کی بوڑھی ماں بھی پٹتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ محمد کی بیوی کے بھائی اپنی بہن کو زبردستی گھر لے چلے مجھ کو بھی مجبوراً ان کے ساتھ چلنا پڑا۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ میں کیا کروں۔ پیدل چلنا وہ بھی دن کو کھلے ہندوں مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ماموں کا انتظار نہ سکتی تھی یعنی ٹھہر ہی نہ سکتی تھی۔ میرے تمام سامان میں اب صرف لوٹا تھا چنانچہ یہ لوٹا لیا اور چل کھڑی ہوئی۔ میرے روپے پیسے اور زیورات سے محمد صاف مکر گیا۔

اب راستہ میں مجھے ایک اور مصیبت علم ہوا۔ بلکہ ابھی تو شبہ ہوا۔ ایک تو محمد کی بیوی کا اپنے چھوٹے بھائی سے باتیں دیر تک کرنا۔ اور پھر اس کے بعد ہی سے میرے اوپر مسز محمد کی عنایات کی فراوانی۔ بطور اعلان عنایت وہ بولی کہ "تم اب ہمارے یہاں چلو اور میرے چھوٹے بھائی سے شادی کرلو۔ یہ ابھی کنوارا ہے"۔

"یا میرے اللہ! اب میں کیا کروں!" میں نے اپنے دل میں کہا۔ اور مصلحت وقت دیکھتے ہوئے میں نے کہا کہ "میں سوچ سمجھ لوں تب کروں گی۔ اول کرنا ہے۔ آخر کرنا ہے۔ اگر تمہارے بھائی کو میں نے دیکھا آدمی

ہے تو ضرور کر لوں گی۔"

سب تکلف برطرف کرکے وہ یہ سُن کر خوش ہو گئی۔ اور لطف تو دیکھئے کہ فوراً دوڑ کر بھابی سے کہا۔ اور بھابی صاحب کی برجستگی ملاحظہ ہو کہ فوراً انھوں نے لپک کر میرے چادر سے لپٹے ہوئے منہ میں جھانک کر کہہ دیا کہ میں بہت ہونہار اور لائق نوجوان ہوں اور بہت آرام سے رکھوں گا۔ اور بطور ٹیپ کے بند کے کہا "جو کوئی کبھی تجھ سے بولے گا اس کا مرچھا ڈالوں گا۔"

میں بُری طرح تھک گئی اور چلنا دوبھر ہو گیا۔ مگر جس طرح بھی ہو سکا سفر پورا کیا

اب یہاں پہنچکر کیا معاملات پیش آئے۔ اگر مفصل بیان تو سفینہ چاہیے۔ قصہ کو اس طرح مختصر کرتی ہوں کہ یہاں پہنچ کر اول تو یہ اعلان ہو گیا کہ میں چھوٹو محمد کا چھوٹا سالا / کی بہو یعنی بیوی ہوں۔ مطلب ان عزیزوں کا بجز یہی تھا کہ ہونے والی ہوں کیونکہ نکاح کرنے کے ارادے کا ذکر بھی تھا۔ لیکن تیسرے ہی روز منجھلے بھائی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا جن کی بیوی مر چکی تو انھوں نے مجھے اپنے لیے زیادہ موزوں تصور فرمایا۔ چھوٹو کو بلا کر انھوں نے کہا کہ تیری شادی میں اپنی سالی سے کرا دوں گا۔ بڑے بھائی نے بھی اس کی تائید کی لیکن چھوٹو مجھ پہ فدا ہو چکے تھے۔ اور جب وہ رضامند نہ ہوئے تو انھوں نے جوتا سنبھالا۔ اور بغیر کسی قسم کی طویل گفت و شنید کے میری وجہ سے میاں چھوٹو کی وہ کندی کی گئی کہ بس دھن کے ڈال دیئے گئے۔ میں نے جو انکار کیا تو بڑے بھائی صاحب چھوٹو کو چھوڑ کر مجھ پر ٹل پڑے ہوتے۔ میں ہوش باختہ ہو گئی۔ ڈانٹ کر انھوں نے کہا۔ آج ہی قاضی آئیگا۔ نئے منگیتر نے بھی کہا کہ مجھے چوٹی پکڑ کر مارے ڈنڈوں کے شلفہ کر دینگے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ معاملہ دگرگوں

ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ایک خواب نکلا۔ وہ یہ کہ میاں چھوٹو قدرتاً میرے طرفدار ہو گئے۔ یعنی ان کا فرض ہو گیا کہ میرا نکاح اپنے بھائی کے ساتھ نہ ہونے دیں۔ بہن بھی یہی چاہتی تھی کہ میرا نکاح چھوٹو کے ساتھ ہو۔ لہٰذا اب ہم تین ایک طرف ہو گئے۔ مگر بڑے بھائی کی شہزوری اور قہاری کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ! چھوٹو سے میں نے کہا "تو ماموں کو تار دیدے میں تیرے ہی ساتھ نکاح کروں گی۔ اور دوسرا تار میرا ایک رشتہ کا بھائی ہے اُسے دیدے" چنانچہ کاغذ قلم دوات لے کر چپکے میں نے اب دو تار لکھے۔ ایک تو پھر ماموں کو اور ایک اپنے لوٹا بدل بھائی کو۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ میں یہ سوچی کہ جس نے پیاسا دیکھ کر میری مدد کی وہ اب بھی ضرور میری مدد کریگا۔ چھوٹو کے پاس روپیہ نہ تھا تو چپکے سے میں نے اپنا وہی لوٹا دیا کہ اس کو بیچ ڈال مگر تار جلدی دے۔

اِدھر تو میں تار کے جواب کی دوسرے روز منتظر تھی۔ اور اُدھر قاضی کے بلوانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ چھوٹو نے اعلان کر دیا کہ میں قاضی کو مار ڈالوں گا۔ اگر اس نے نکاح پڑھایا اور ادھر میں نے قسم کھالی کہ اگر میں یہاں نکاح کروں گی تو تجھ سے نہ کہ تیرے بھائی علی سے۔ اس کا نام جو جبراً مجھ سے شادی کرنے پر تلا ہوا تھا علیؔ یا الیؔ تھا۔

تار کو دیتے ہوئے تیسرا دن تھا۔ مگر کسی طرف سے کوئی جواب یا خبر کا پتہ نہ تھا۔ میرے اوپر اب کی نگرانی سخت ہوتی جا رہی تھی۔ قاضی آج رات کو آنے والا ہو رہا تھا۔ مگر میں نے بھی چھوٹو کو اپنی حمایت میں تیار کر لیا تھا۔ بہن اب بالکل خاموش تھی دل سے وہ چھوٹے بھائی کو چاہتی تھی۔ مگر بڑے بھائیوں کی زبردست مار کا ڈر بہت تھا۔ میں اب سب سے بڑے بھائی کی بیوی کی نگرانی میں تھی جو نہایت ہی زشت خو عورت معلوم ہوتی

تھی۔

جوں جوں دن گذرتا جاتا تھا میری حالت ناگفتہ بہ ہوتی جاتی تھی۔ بہت ہمت باندھتی تھی مگر دل کمزوری اور پریشانی کے مارے ڈوبا جاتا تھا۔ اور اب میں پچھتا رہی تھی کہ ہائے میں کیوں ماموں کا گھر چھوڑ کر آئی۔

لوٹے کا راز

حصّہ دوئم

ہم دونوں یعنی بھائی شنذری اور میں بارہ بنکی سے لوٹ کر لکھنؤ آئے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ اور وہاں سے بھائی شنذری نے اپنے اس نادیدہ دوست کو تار دیا جس نے ان کے زہا پے ٹکس کس کر دیئے تھے۔ بھائی شنذری تو لکھنؤ ہی میں رہے اور میں "لکھنؤ سے آگے" چلا گیا۔ دوسرے روز اپنے کام سے فراغت حاصل کر کے آگیا۔ چند روز لکھنؤ میں اور رہے۔ پھر اس کے بعد دونوں ساتھ ہی لوٹے۔ بھائی شنذری نے علی گڈھ پر یکٹس کرنے کی کوشش کی شروعات کا آغاز ہی کیا تھا۔ میں نے بھی کہا کہ چلو دو روز علی گڈھ ہی میں رہیں گے۔

عقل نہیں کام کرتی۔ بعض اوقات اتفاق عجیب و غریب واقعات پیش کرتا ہے۔ کالج کا پوسٹ مین قریب قریب سب کو جانتا ہی ہے۔ کالج آجکل بند تھا۔ اتفاق تو دیکھیے ہم دونوں تانگہ پر اسٹیشن سے چلے آرہے تھے کہ راستہ میں "روکنا روکنا" کی آواز پیچھے سے آئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کالج کے ڈاکیہ

صاحب ہانپتے کانپتے چلے آ رہے ہیں۔ خیر تو ہے میں نے دل میں کہا اور انھوں نے کہا کہ آپ کا کل شام کو ایک تار آیا تھا بورڈنگ کے پتہ پر۔"

میں چونک پڑا اور میں نے کہا "پھر وہ کیا ہوا؟"

"بذریعہ ڈاک آپ کے گھر کے پتے پر بھیج دیا۔"

"کہاں سے آیا تھا، کس نے بھیجا تھا؟" میں نے پوچھا

"صاحب! وہ تار کیا تھا، تماشہ یا مذاق تھا۔ مجھے تو تفصیل معلوم نہیں۔ آپ ڈاک خانہ میں جا کر اس کی نقل دیکھ لیجیے۔ کچھ بابو لوگ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔" ڈاکیہ نے کہا۔

میں نے بہت کچھ دریافت کرنا چاہا۔ مگر ڈاکخانہ بھی قریب تھا۔ بھائی شنذری نے کہا کہ چلو ڈاکخانہ پہلے چلیں۔ ڈاکخانہ پہونچے اور تار کی نقل جو دیکھی تو حیرت سے میں بھائی شنذری کی طرف دیکھتا ہوں اور وہ میری طرف۔

آپ یقین مانیں کہ تار حسب ذیل تھا:۔

"جس سے تمہارا لوٹا بدل گیا سخت مصیبت میں ہے۔ جلدی بچاؤ۔"

نہ تو بھیجنے والے کا نام اور نہ جگہ کا۔ ہاں یہ معلوم ہوسکتا تھا یہ تار ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن سے دیا گیا ہے۔

"فوراً واپس جاؤ تم۔" بھائی شنذری بولے "جلدی پہونچو۔"

میں نے کہا بھی کہ آخر میں بلا پتے اور رسید کے کہاں جاؤں۔ مگر بھائی شنذری نے کہا کہ تم کچھ پرواہ نہ کرو سیدھے وہیں پہنچو۔ خود پتہ لگ جائے گا۔ تار بابو کو سب پتہ ہوگا ورنہ نام اور پتہ تار دینے والے کا ضرور ہوتا۔

جسے کہتے ہیں الٹے قدم لوٹنا۔ وہی میں نے کیا۔ تین گھنٹے بعد گاڑی جدھر سے آتی تھی ادھر ہی جاتی تھی۔ کچھ روپیہ بھائی شنذری سے لیا۔ اور صرف ایک دو سوتی تکیہ اور وہی بدلا ہوا لوٹا لے کر میں چلتا بنا۔ "تار دینا۔" بھائی شنذری نے مجھ سے کہا۔ یہاں ان قیاسات کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے جو

مسیکر اور بھائی شذری کے ذہن میں آئے۔ بھائی شذری اور میں نے عجیب عجیب طرح کے قیاسات لگائے۔ مثلاً:

"مجھ پر وہ عاشق ہو گئی......بدمعاش عورت ہے......احتیاط بڑی چیز ہے......چولھے میں ڈالو جی......مگر عورت کی مدد کرنا فرض ہے......جان جاتی رہے کچھ پرواہ نہیں......کہیں کسی ہٹے کٹے بدمعاش نے تو تار نہیں دیا! شاید اس نے لوٹا بدلتے دیکھ لیا ہو......مگر لاحول ولاقوۃ......لوٹا اس نے کیسے دیکھا ہوگا......کسی کلاس فیلو کی تو وہ عزیز نہیں کہ اس نے سوچا ہو کہ لاؤ ذرا اسے دوڑاؤ تو......مذاق ہے......مگر خیر......کہیں کوئی قتل تو اسے نہیں کر رہا ہے......اس سے زبردستی شادی کرنے کے لیے جا رہے ہوں گے......کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے......ورنہ کچھ نہ کچھ بات تو ہے ہی وغیرہ وغیرہ"

دوپہر کے بعد میں منزل مقصود پر پہونچ گیا۔ تار بابو اسٹیشن ماسٹر سے میں نے عجیب احمقانہ سوال کیا۔

"کیوں صاحب یہاں سے پرسوں کسی نے تار دیا تھا؟" اب مجھے احساس ہوا کہ مجھے ٹھیک تاریخ اور وقت روانگی تار نوٹ کر لینا چاہیے تھا۔ خدا کے واسطے آئندہ ناظرین میں سے کوئی صاحب اگر ضرورت خدانخواستہ پڑے تو یہ بات ضرور نوٹ کر لیں۔

تار بابو صاحب مجھے غور سے دیکھا۔ احمق خیال کرنے میں شاید تھوڑا سا شک کیا۔ انہیں داہنی طرف کھڑکی کی طرف ویسے ہی گردن موڑنا تھی۔ لہٰذا اول تو انھوں نے جمائی لی کہ مجھے کہ اس چہرے پر آنکھیں کہاں تھیں اور پھر نفی میں اس طرح جواب دیا کہ میری طرف تیزی سے دیکھ کر کھڑکی میں منہ ڈال کر چلائے "یہ گائے کس کی ہے پکڑوا اسے، یہ ریلوے کے

احاطے میں کیسے آ گئی؟"

پھر میری طرف دیکھ کر ایسے بولے کہ جیسے میری گائے ہے "ریلوے کے احاطے میں گائیوں کا حکم ہی نہیں ہے۔"

میں نے پھر کہا کہ "صاحب اس قسم کا تار یہاں سے کوئی پرسوں یا اس سے ایک روز پہلے دیا گیا۔" یہ کہہ کر میں نے ایک کاغذ ان کے سامنے کر دیا، اپنے حافظہ سے میں نے تار کا مضمون لکھا تھا۔

بابو صاحب نے کاغذ کو دیکھا پھر مجھے دیکھا اور پھر کاغذ کو۔ اور پھر بولے۔ "آپ کا لوٹا بدل گیا تھا؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

"کیسے!" وہ بولے "کیسے بدل گیا۔ . . . کوئی بیمار ہو گیا؟ یہ کون ہے لوٹے والا . . . ؟"

میں نے ان سے کہا "معاف کیجئے میں پوری تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن اگر آپ مجھے اپنا رجسٹر دیکھ کر تار دینے والے کا پورا پورا پتہ یا اور تفصیل بتا دیں تو عین عنایت ہو۔"

اس کے جواب میں وہ رکھائی سے بولے "تار کے رجسٹر دکھانا منع ہیں!"

میں نے کہا "حضرت میں قاعدہ نہیں پوچھ رہا ہوں آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ آپ نے یہ تار دیا تھا؟"

"میں نے یہ نہیں دیا جناب۔ ڈیوٹی پر چھوٹے بابو ہونگے اس وقت۔"

میں نے جلدی سے چھوٹے بابو صاحب کے کوارٹر کا رستہ لیا۔ وہ اندر سے نکلے۔ انھوں نے مضمون کو دیکھا اور کہا کہ ہاں یہ تار میں نے دیا ہے بس اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے۔ میں نے انھیں ہمدرد بنانے کے لیے مختصر تفصیل جو سنائی تو انھوں نے آنکھیں پھاڑ دیں بے حد متاثر ہوئے کہنے

سے لگے۔ مجھے کیا معلوم تھا ورنہ میں خود تفصیل پوچھ لیتا۔ گاؤں تک کا وہ پتہ بتانے سے وہ قاصر تھے مگر انھوں نے بے حد ہمدردی ظاہر کی اور اتنا پتہ ضرور دیا کہ اس گرد ونواح میں کوئی مسلمان زمیندار قسم کے یا اونچی ذات کے نہیں رہتے۔ یہ بھی میرے لیے بڑی بات تھی اور اب میں اس اشارہ سے دوسرا راستہ پا گیا۔ وہ یہ کہ یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ کون کون سے دیہات کون کون سی ذات کے اور کتنی تعداد میں مسلمان رہتے ہیں۔

چنانچہ اس تحقیقات کو مکمل کرنے کے لیے میں نے اس چھوٹے سے اسٹیشن کے مسافر خانہ کا رُخ کیا۔ اور میرے تعجب اور پریشانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ مسافر خانہ میں دو بڑی بڑی دیسی کپڑے کے تھانوں کی سی گٹھڑیاں رکھی ہوئی ہیں اور ان کے پاس ہی دو ایک پوٹلیاں رکھی ہیں اور وہیں پہ وہی لوٹا بھی رکھا ہوا ہے۔

میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ میں کس قدر خوش ہوا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس اسباب کا کون مالک ہے۔ چنانچہ میرا قریب جاکر غور سے جھک کر لوٹے کو دیکھنا کہ ایک صاحب آ کھڑے ہوئے۔ تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ میں نے ان سے لوٹے کے بارے میں پوچھا۔ کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھکر انھوں نے رُکتے رُکتے مفصل جواب دیا کہ دیسی کپڑے گاؤں گاؤں بیچتا پھرتا ہوں۔ فلاں فلاں گاؤں میں ایک آدمی سے میں نے دو روپیہ میں مول لیا ہے۔ مجھے لوٹے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ایک بنئے کا البتہ انھوں نے نام بتایا جس کی دوکان پر یہ سودا ہوا تھا۔ اور گاؤں کا نام پتہ اور راستہ بتایا فاصلہ کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ کیونکہ دوسرے گاؤں میں ہوکر اسٹیشن آرہے تھے۔

میں نے جلدی سے ایک مزدور کو تلاش کیا جو گاؤں کا راستہ جانتا تھا اور کس تیزی سے میں نے تیر کی طرح روانہ ہوا ہوں کہ بیان سے باہر۔

سورج ڈوب چکا تھا چھٹپٹا وقت تھا۔ اور منزل مقصود یعنی گاؤں دور سے کھیتو اور باغوں اور دوسرے درختوں کی آڑ میں ایک دُھندلکے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ کس سُرعت کے ساتھ تاریکی کھیتوں اور بیابانوں میں بڑھتی ہے۔ شام اور رات کے درمیان کس قدر کم وقفہ ہوتا ہے۔ میں نے اس امر پر غور کیا اور اب عام راستہ چھوڑ کر ایک کھیت کی مینڈھ پر میں تیزی سے چل رہا تھا۔ اپنی داہنی جانب میں نے دیکھا کہ کوئی شخص جیسے میرے سایہ سے پرّاں ہوکر اندھیری رات میں راستہ کاٹتا ہے۔

"کون ہے؟" میں نے کہا "کون ہے یہ؟"

"ارے دیکھنا پکڑنا" دیہاتی لہجے میں دور سے گاؤں کی طرف تاریکی سے میری آواز سُن کر کوئی پکارا۔

"کون ہے؟" میں نے پھر زور سے پکارا اور کوئی جواب نہ آنے پر میں دوڑا۔ چشم زدن میں میں سر پر پہونچا اور چلّایا "کون ہے خبردار، ٹھہرو نہیں میں بندوق مارتا ہوں!"

میرا یہ کہنا تھا کہ بھاگنے والے کے جیسے کسی نے پیر تھام لیے۔ میں تیزی سے لپکا ہوا پہنچا۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں رُکنے والا حملہ نہ کر دے میں آہستہ ہوگیا اور میں نے دیا سلائی نکالی کہ جلاؤں۔ پُشت پر سے دوڑتے بھاگتے آدمیوں کی آوازیں آئیں کہ "پکڑ لینا جانے نہ پائے"

میں نے ذرا قریب پہنچکر دیا سلائی جلائی اور جلاکر اپنے سر پر کی ہے کہ دیکھ سکوں کون ہے۔ قبل اس کے کہ میں دیکھ سکوں کہ کون ایک طرف سے یعنی میری بائیں جانب سے دیہاتی جھپٹ کر پہونچے۔ کہ لینا۔ اور سامنے سے ایک چیخ مار کر مجھے بچاؤ کہہ کر دوڑ کر وہی بیکس لڑکی مجھ سے لپٹ گئی۔ "مجھے بچاؤ" اس نے پھر کہا "میں وہی ہوں"

اگر ایک طرف میرا مشن کامیاب ہوگیا تو دوسری طرف ان دیہاتیوں

کے ہوش زائل ہو گئے۔

"تم کون لوگ ہو؟" میں نے انتہائی غصہ سے ڈپٹ کر لڑکی کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

لڑکی سہمی ہوئی میرے پیر پکڑے ہوئے بیٹھی تھی اور میں ان لوگوں کو پولیس اور گورنمنٹ اور اسی قسم کی دوسری ان بلیات سے ڈرا رہا تھا جو خدا کے غضب کی صورت میں انسانوں پر نازل ہیں۔ "اگر تم خیریت چاہتے ہو تو سیدھی طرح ابھی ابھی اس لڑکی کو اسٹیشن تک پہنچاؤ ورنہ خیر نہیں ہے۔" میں نے آخری حکم نامہ کی صورت میں کہا "جانتے ہو تم لڑکی کون ہے؟"

جب تک میں اسٹیشن نہیں پہنچ گیا مجھے طرح طرح کے خطرے کا خیال ستاتا رہا۔ اسٹیشن پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا کہ بیکخت میں تمہیں کہاں پہنچا دوں اور تمہارے اوپر آخر کیا افتاد پڑی؟"

میرے اس سوال پر اس نے اپنی پر درد داستان اطمینان سے بیٹھ کر سنائی حرف بحرف اور بے کم و کاست۔ الف سے لے کر ی تک اور پھر قبل اس کے کہ میں پوچھوں کہ اب تمہیں کہاں پہنچا دوں اس نے مجھ سے کہا کہ "مجھے کہاں لے چلو گے؟"

سوائے اس کے اور میں کیا کہتا کہ "اپنے والد کے پاس۔" اس نے اظہار شکریہ میں اپنا منہ اپنی چادر سے چھپا کر اس کو تر کرنا شروع کیا۔

چنانچہ میں اپنے والد صاحب کے پاس لے گیا اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے مشورے نہیں بلکہ حکم سے وہ کیا جو کرنا چاہئے تھا یعنی اس کے ماموں کے پاس بھیجدیا اور وہاں جا کر نکاح کر لیا۔

ڈپٹی صاحب مرحوم کی جائداد اور جتنا ان کے لڑکوں کا حصہ تھا وہ مقدمہ بازی کر کے ڈیڑھ سال میں واپس لیا اور لڑکوں کے

نام جائداد کرادی۔

کم از کم ابھی تک تو مجھے اس فعل پر پچھتانا نہیں پڑا ہے۔ آئندہ خدا جانے۔

تمام شد

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

کتبہ
ذوالفقار احمد

Atiya